رنگِ خیال

انٹرفیتھ ڈائیلاگ۔ایک قرآنی تقاضا

لکن الراسخون فی العلم منهم والمومنون یومنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک والمقیمین الصلوٰۃ والموتون الزکوۃ والمومنون باللہ والیوم الاخرہ

اولٰئک سنوتیهم اجرا عظیما۔ (النساء:۱۶۲)

لیکن ان میں سے جو پختہ علم والے ہیں اور ایمان والے ہیں۔ وہ اس (وحی) پر ایمان لاتے ہیں، جو آپ پر نازل کی گئی ہے اور اس پر جو آپ سے پہلے نازل کی گئی ہے اور (خصوصیت کے ساتھ) صلوٰۃ قائم کرنے والے اور زکوٰۃ ادا کرنے والے اور اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لانے والے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں، جن کو ہم عنقریب اجر عظیم عطا فرمائیں گے۔

اس آیت میں بعض یہود و نصاریٰ کو راسخون فی العلم اور مومنونٗ کے وصف سے نمایاں کیا گیا ہے۔ گویا انہیں اپنے مذہب کا پہلے سے سچا مومن قرار دے کر، قرآن پر ایمان لانے والا بتایا گیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہر مذہب میں سچے اور اچھے لوگ ضرور ہوتے ہیں اور وہ اپنے مذہب کے مومن ہوتے ہیں۔ اس لیے کسی بھی مذہب کے ماننے والوں کو ایک لکڑی سے ہانکنا، خود قرآن کے خلاف ہے۔ کسی بھی مذہب کا اچھا آدمی بہر حال اچھا ہوتا ہے اور کسی بھی مسلک و نظریے کا برا آدمی بہر حال برا ہوتا ہے۔ یہ بہت اہم نکتہ ہے۔ فی زمانہ اسے سمجھنے کی شدید ضرورت ہے۔

جس طرح دورِ رسالت مآب ﷺ میں بعض یہود و نصاریٰ اپنے علم میں راسخ اور مومن تھے یعنی نرے مقلد کے طور پر اگلوں کے پیچھے چلنے والے نہیں بلکہ تحقیق پسندانہ رویے کے باعث قرآن کریم پر ایمان لانے والے بنے۔ اسی طرح زمانہ مابعد میں بھی ایسے راسخون فی العلم اور مومنون کا وجود غیر مستبعد ہرگز نہیں۔ یقیناً آج بھی اہل کتاب میں سے جو بھی راسخون فی العلم اور مومنین ہوں گے، وہ ایک نہ ایک دن ضرور قرآن کریم پر ایمان لے آئیں گے۔ ماضی قریب و بعید میں اہل کتاب کے متعدد اصحاب علم و فضل نے اسلام قبول کیا ہے۔ موریس بوکائے، علامہ اسد، مارما ڈیوک پکتھال جیسے سینکڑوں نام ہماری تاریخ میں ہیرے کی طرح جگمگا رہے ہیں۔ اور اب مستقبل قریب و بعید میں کتنے علمائے یہود و نصاریٰ و دیگر مشرف بہ اسلام ہونے والے ہیں۔ یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ واضح ہو کہ راسخون فی العلم سے مراد علماء اہل کتاب اور المومنون سے مراد مومنین اہل کتاب ہیں جو شاید اپنے قبول اسلام میں کسی انٹرفیتھ ڈائیلاگ کے منتظر ہیں۔ (مدیر اعلیٰ)

عورتوں کا کھلے چہروں کے ساتھ بیرونِ خانہ زندگی میں کردار

(قرآن کی روشنی میں ایک علمی بحث)

ڈاکٹر محمد شکیل اوج
استاذ التفسیر، شعبہ علوم اسلامی، جامعہ کراچی

اسلام میں عورتوں کے پردے اور بیرونِ خانہ زندگی میں انکے کردار کے تعین کا مسئلہ ایک بار پھر شدت سے زور پکڑ گیا ہے۔ کیونکہ عالمی تناظر میں اب یہ مسئلہ دو تہذیبوں کے مابین وصل و فصل کی بنیاد بنتا جا رہا ہے۔ مسلمانوں کی اقدار چونکہ اساسی طور پر قرآن حکیم سے وابستہ ہیں اس لیے ہر مسئلہ کو وہ اسی سرچشمہ علم و ہدایت سے حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں نے بھی اس غیر معمولی اہمیت کے حامل مسئلہ کو کتاب اللہ سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ آیئے آپ بھی میرے مطالعہ میں شریک ہو جایئے۔ اس ضمن میں میرا موقف اپنے عنوان سے ظاہر ہے جس کے دلائل حسب ذیل ہیں۔

پہلی دلیل۔ قل للمومنین یغضوا من ابصارهم ویحفظوا فروجهم۔ (النور:۳۰)

آپ مومن مردوں سے کہہ دیجیے کہ وہ (نامحرم عورتوں کی طرف) دیکھنے میں کچھ کمی کریں (یعنی اپنی نگاہوں میں حیا اور ادب پیدا کریں) اور ان مقامات کی حفاظت کریں جو محل خطرات ہیں۔

اس آیت میں مردوں کو غضِ بصر کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ حکم اسی وقت قابل فہم ہو سکتا ہے کہ جب عورتوں کے چہرے کھلے ہوں۔ اگر چہرے ملفوف ہوں تو مردوں کو غضِ بصر کا حکم دینا بے معنیٰ ہوگا۔

دوسرے یہ کہ من ابصارہم میں من تبعیضیہ ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ نامحرم عورتوں کو اس طرح دیکھنا کہ گویا مردوں کی شعاع بصری ان کا احاطہ کر رہی ہے، ممنوع ہے یعنی انہیں سرتاپا گھور کر دیکھنا یا ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا منع ہے نہ کہ اچٹتی ہوئی نظروں سے۔

غض بصرہ کے معنی اقرب میں یہ لکھے گئے ہیں منعہ عما لا یحل لہ رویۃ۔ یعنی اپنی آنکھ کو اس چیز سے روکا جس کا دیکھنا منع ہے۔ مطلب یہ کہ نظر شہوت دیکھنا ممنوع ہے۔ ام شریک رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حوالہ سے ایک روایت نقل کی گئی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ان کے بارے میں فرمایا (ام شریک رضی اللہ تعالیٰ عنہا) "ایک ایسی عورت ہے کہ اس کے پاس میرے اصحاب کا جمگھٹا لگا رہتا ہے"۔ یہ روایت نقل کرنے کے بعد علامہ سعیدی فرماتے ہیں: "صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، حضرت ام شریک رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی زیارت کرتے تھے اور انکی نیکی کی وجہ سے بہ کثرت ان کے پاس آتے جاتے تھے"۔(۱)

وقل للمومنت یغضضن من ابصار هن و یحفظن فروجهن۔ (النور/۳۱)

اور آپ مومن عورتوں سے فرما دیجئے (نامحرم مردوں کی طرف) دیکھنے میں کچھ کمی کریں۔ (یعنی اپنی نگاہوں میں حیا اور ادب پیدا کریں) اور ان جگہوں کی حفاظت کریں، جو محل خطرات ہیں۔

اس آیت میں عورتوں کو بھی وہی حکم دیا گیا ہے۔ جو اوپر کی آیت میں مردوں کو دیا گیا ہے۔ یعنی جسطرح مردوں کا عورتوں کو گھورنا منع ہے۔ اسی طرح عورتوں کا بھی مردوں کو گھور گھور کر دیکھنا منع ہے۔ گویا غض ابصار اور حفظ فروج کا حکم دوطرفہ ہے، یکطرفہ نہیں ہے۔ اس لیئے ان قرآنی فقرات سے فقط عورت کے چہرے کا پردہ کسی صورت بھی مستنبط نہیں ہوسکتا۔ سوائے اس کے کہ پردے کا حکم دوطرفہ ہو۔ یعنی مرد حضرات بھی اپنے چہروں کو چھپائیں اور یہ محال ہے۔

یغضضن من ابصار هن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کے لئے کچھ اس طرح کی اوڑھنی یا نقاب تجویز کرنا کہ جس سے وہ کسی فرد یا شئے کو اچٹتی ہوئی نظروں سے بھی نہ دیکھ سکیں، یقینی طور پر منشائے قرآن کے خلاف ہے۔

دوسری دلیل: ولا یبدین زینتهن الا ما ظهر منها۔ (النور/۳۱)

اور (عورتوں کو چاہیئے کہ وہ) اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں۔ سوائے اس کے جو آپ سے آپ ظاہر ہو۔

یہاں زینت کا مفہوم سوائے عورتوں کی آرائش و زیبائش کے کچھ اور نہیں ہوسکتا۔ ڈاکٹر محمد طاہر القادری نے اس فقرہ کا ترجمہ یوں الفاظ کیا ہے:

"اور اپنی آرائش و زیبائش کو ظاہر نہ کیا کریں۔ سوائے (اسی حصے) کے جو اسمیں سے خود ظاہر ہوتا ہے"۔(۲)

گو ہمارے ہاں اس سے مراد بالعموم عورتوں کے چہروں، ہتھیلیوں اور پاؤں کو لیا گیا ہے۔ مگر منها کے لفظ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس سے کچھ زائد یعنی وجھ، کفین، اور قدمین کا بناؤ سنگھار، جو موقع و محل کی مناسبت سے اختیار کیا جاتا ہے۔ مثلاً کہیں مہندی، سرمے یا کاجل سے کام چل جاتا ہے۔ کہیں ضرورت سرخی پاؤڈر اور لپ اسٹک وغیرہ کی متقاضی ہوتی ہے۔ اور کہیں زینت انگوٹھیوں، چھلوں اور چوڑیوں کا تقاضا کرتی ہے۔ کیونکہ جب مذکورہ بالا اعضاء کھلے ہوں گے تو لامحالہ ان کے ساتھ انکی زینت بھی ظاہر ہوگی۔ اور وہی یہاں مراد ہے۔ جسے روا رکھا گیا ہے۔ بعض علماء نے زینت سے مراد عورتوں کا لباس بھی لیا ہے۔ جو اوپر بڑی چادریں لینے کے باوجود ان کے چلنے پھرنے اور اٹھنے بیٹھنے میں گاہ بگاہ ظاہر ہوتا رہتا ہے۔

امین احسن اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ کے بقول "زینت کی چیزوں میں لباس بھی داخل ہے اور زیورات بھی، ان میں سے ہر چیز کو نہ تو چھپانا ممکن ہے۔ نہ ہر چیز کا ظاہر ہونا ناگزیر ہے۔ لباس کا بھی ظاہری حصہ، بہرحال ظاہر ہو کے رہے گا اور زیورات بھی بالخصوص ہاتھ کے بعض زیورات بغیر زحمت کے نہیں چھپائے جاسکتے"۔(۳)

تفسیر روح المعانی میں الا ما ظهر منها کے تحت لکھا گیا ہے۔ ای الا ما جرت العادة والجبلة علی ظهوره والاصل فیه الظهور کالخاتم والفتخة والکحل والخضاب فلا مواخذة فی ابدائه للاجانب وانما المؤاخذة فی ابداء ما خلق من الزینة کالسوار والخلخال والدملج والقلادة والاکلیل والوشاح والقرط۔ (۴)

یعنی سوائے اسکے جو عادۃً اور طبعاً کھلا رہتا ہے اور کھلا رہنا ہی اسکی اصل ہے۔ جیسے انگوٹھی، چھلا، سرمہ اور مہندی، جسے نامحرموں کے سامنے ظاہر کرنے پر کوئی مواخذہ نہیں۔ البتہ چھپائی جانے والی زینتوں کے ظاہر کرنے پر مواخذہ ہے۔ مثلاً کڑے، جھانجھر، بازو بند، ہار، مرصع پنکا یا مالا اور بالیاں وغیرہ۔

ذرا آگے چل کر لکھا ہے:

وما ذکره الزمخشری مبنی علی المشهور من مذهب الامام ابی حنیفة من ان مواقع الزین الظاهرة من الوجه والکفین والقدمین لیست بعورة مطلقا فلا یحرم النظر

(النساء(۵)

اور زمخشری نے امام ابو حنیفہ کے مشہور مذہب کے موافق اپنا موقف یہ لکھا ہے کہ کھلی زینتوں کے مقامات میں (عورت کا) چہرہ دونوں ہتھیلیاں اور دونوں قدم مطلقاً ستر سے خارج ہیں۔ لہٰذا ان اعضاء کی طرف نظر کرنا حرام نہیں ہے۔

علامہ آلوسیؒ نے اپنی تفسیر میں سنن ابی داؤد کی یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ اسماء بنت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہما نبی کریم ﷺ کے پاس آئیں بایں حال کہ انہوں نے بہت باریک لباس پہنا ہوا تھا تو آنحضرت ﷺ نے ان سے منہ پھیر لیا اور فرمایا۔ اے اسماء، جب عورت بالغ ہو جائے تو اس کے لیے مناسب نہیں ہے کہ اس کے جسم کا کوئی حصہ نظر آئے، سوائے اس کے، یہ کہہ کر آپ ﷺ نے چہرے اور ہتھیلیوں کی طرف اشارہ کیا۔ اس روایت سے بھی معلوم ہوا کہ عورت کا چہرہ ستر میں شامل نہیں ہے۔ (۶)

امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی تفسیر میں ماظہر منھا کے معنی قفال سے یہی نقل کیے ہیں۔ الا ما یظھر الانسان فی العادۃ الجاریۃ. یعنی جسے انسان عادۃً اور طبعاً ظاہر کرتا ہے (یعنی چہرہ ہاتھ اور پاؤں) اور کشاف میں بھی یہی قول نقل کیا گیا ہے۔

اور امام ابن جریر طبری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس سلسلے میں تین اقوال ذکر کیے ہیں اور اپنا مختار جس قول کو قرار دیا ہے وہ وہی ہے جو اوپر مذکور ہوا۔ یعنی چہرہ اور ہاتھ اور اسمیں سرمہ، انگوٹھی، کڑے اور مہندی غرض سبھی کو داخل کیا ہے۔ بقول ابن جریر کے "ہم اسے صحیح تر قول اس لیے قرار دیتے ہیں کہ اس بات پر سب کا اجماع ہے کہ ہر نمازی کے لیے ضروری ہے وہ نماز کے وقت ستر عورت کرے، اور عورت کے لیے ضروری ہے کہ اپنا چہرہ اور ہاتھ کھلے رکھے"۔ (اس سے معلوم ہوا کہ عورت کا چہرہ ستر عورت میں شامل نہیں ہے۔ اور جو چیز ستر عورت میں شامل نہیں اسے ظاہر کرنے میں کیا اعتراض کیا جا سکتا ہے)۔ ابن جریر نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے عورت کو نصف ذراع (یعنی آدھی کلائی) کھولنے کی اجازت دی ہے۔ (۷)

تیسری دلیل: ولیضربن بخمرھن علی جیوبھن۔ (النور/۳۱)

اور عورتوں کو چاہیے کہ وہ (اپنے سروں پر اوڑھے ہوئے) دوپٹوں کو اپنے گریبانوں پر (بھی) ڈال لیں۔

خمر خمار کی جمع ہے اور خمار کے معنی ہیں۔ ھو ما تغطی بہ المراۃ راسھا۔ (اقرب)

یعنی خمار وہ چادر ہے، جس کے ساتھ عورت اپنے سر کو ڈھانکتی ہے۔ جیوب، جیب کی جمع ہے قمیص کے گریبان کو کہتے ہیں۔ مجازاً سینے کو کہا جاتا ہے۔

اگر اسلام میں چہرہ کا پردہ ہوتا تو یہ فقرہ یوں ہوتا۔ ولیضربن بخمرھن علی وجوھھن۔ یعنی بجائے جیوبھن کے وجوھھن ہوتا جس سے بات بالکل واضح ہو جاتی کہ چہرہ بھی چھپانا ہے۔ مگر اس فقرہ نے بات بالکل صاف کر دی کہ اسلام، عورتوں کے سینوں کو چھپا ہوا دیکھنا چاہتا ہے نہ کہ ان کے چہروں کو۔

ولا یبدین زینتھن الا لبعولتھن او اٰبائھن او اٰباء بعولتھن او ابنائھن او ابناء بعولتھن او اخوانھن او بنی اخوانھن او بنی اخواتھن او نسائھن او ما ملکت ایمانھن او التٰبعین غیر اولی الاربۃ من الرجال او الطفل الذین لم یظھروا علی عورٰت النساء۔

(النور/۳۱)

اور وہ اپنی زینت کو (کسی پر) ظاہر نہ کریں سوائے اپنے شوہروں کے یا اپنے باپ دادا یا اپنے شوہروں کے باپ دادا یا اپنے بیٹوں یا اپنے شوہروں کے بیٹوں یا اپنے بھائیوں یا اپنے بھتیجوں یا اپنے بھانجوں کے یا (اپنے ہاں کی جانی پہچانی یا ضرورۃً آنے والی) عورتوں کے یا اپنی مملوکہ باندیوں (۸) کے یا مردوں میں سے وہ خدمت گار جو خواہش نفسانی سے خالی ہوں یا وہ بچے جو (کم عمری کی وجہ سے) عورتوں کی پردہ والی چیزوں سے آگاہ نہیں ہوئے۔

سورۂ نور کی آیت نمبر ۳۱ میں زینت کا یہ لفظ دوسری مرتبہ آیا ہے۔ یہ وہ زینت ہے کہ جس کا اظہار بالارادہ محارم کے سامنے جائز اور روا رکھا گیا ہے۔ جبکہ اول الذکر مقام پر زینت کا لفظ غیر محارم کے لیے آیا ہے۔ جس سے مقصود کلام یہ ہے کہ عورتیں غیر محارم کے سامنے زیبائش و آرائش کی چیزوں کو شعوری طور پر نمایاں نہ کریں۔ بس جس قدر ان سے چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے از خود ظاہر ہو جائے۔ وہ معاف ہے۔ یعنی اس زینت کے اظہار میں ان کی نیت، خواہش اور ارادے کا کوئی عمل دخل نہیں ہونا چاہیے۔ جبکہ محارم کے سامنے وہ بالارادہ اپنی زینت کو ظاہر کر سکتی ہیں۔

یہاں زینت کا لفظ مذکورہ بالا زینت ہی کے مفہوم میں آیا ہے۔ جو چہرے، کفین اور قدمین اور اس کے بناؤ سنگھار ہر دو پر مشتمل ہے۔ بصورت دیگر یہ آیت اپنے محل پر صحیح نہیں بیٹھ سکتی۔

ولا یضربن بارجلھن لیعلم ما یخفین من زینتھن ۔(النور/۳۱)

اور (عورتوں کو چاہیے کہ) وہ اپنے پاؤں کو (اس طرح) زمین پر مار کر نہ چلا کریں کہ ان کی مستور زینت کا کچھ حصہ ظاہر ہو جائے۔

اس جملہ نے اس حقیقت کو مزید نمایاں کر دیا ہے کہ اس آیت کا تعلق اصلاً بیرون خانہ زندگی سے ہے۔ جہاں بالعموم غیر محرموں سے واسطہ پڑتا ہے۔ آیت کو بحیثیت مجموعی دیکھنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ان احکام کا تعلق غیر محارم کے سامنے مخصوص ہیئت لباس اور طرز عمل اختیار کرنے سے ہے اور یہ عورتوں کی دو بیرون خانہ زندگی ہے، جسکا انہیں پابند کیا گیا ہے۔ آپ خود دیکھیے کہ

۱۔ یغضضن ابصارھن ۔۔۔ کا تعلق زیادہ تر بیرون خانہ زندگی سے دکھائی دیتا ہے یا نہیں؟

۲۔ ولا یبدین زینتھن الا ما ظھر منھا ۔۔۔ کا تعلق بھی بیشتر بیرون خانہ زندگی سے جڑا ہوا معلوم ہوتا ہے یا نہیں؟

۳۔ ولیضربن بخمرھن علی جیوبھن ۔۔۔ کا جملہ بھی اپنی ضرورت وحاجت کے اعتبار سے بیرون خانہ زندگی کا متقاضی نظر آتا ہے یا نہیں؟

پھر چونکہ غیر محرموں کے ساتھ روا رکھے جانے والے طرز عمل کا استثناء، محارم رشتہ داروں کے ساتھ کرنا بھی ضروری تھا۔ اس لیئے ان احکام میں (بالارادہ) زینت کے اصل ناظرین کا ذکر کیا گیا اور اختتام ذکر پر غیر محارم کے تعلق سے عورتوں کو یہ ہدایت جاری کی گئی کہ وہ زمین پر اس طرح پاؤں مار کر نازو انداز کے ساتھ اٹھلا اٹھلا کر نہ چلیں کہ جس سے ان کی مخفی زینت کا کچھ حصہ ظاہر ہو جائے۔ یہ مخفی زینت عورت کے طرح دار بدن کا لوچ بھی ہو سکتی ہے۔ اس کے کولہے کا مٹکاؤ بھی اور اسکے پستان کا اچھال بھی اور اس سے مراد اس کے پاؤں میں پازیب یا کوئی ایسا زیور بھی ہو سکتا ہے جو اجنبی لوگوں سے چھپایا جاتا ہے۔ اگر اس حکم کا تعلق درون خانہ زندگی سے جوڑا جائے تو یہ حکم اپنی نوعیت کے اعتبار سے نہ صرف عجیب وغریب ہو جائے گا بلکہ آیت میں ایک لاینحل تضاد بھی واقع ہو جائے گا۔

ذرا سوچیے کہ یہ حکم، عورت کی درون خانہ زندگی سے متعلق کیسے ہو سکتا ہے؟ کہ اس زندگی میں تو سرفہرست خود عورت کا اپنا شوہر ہوتا ہے۔ جس کے روبرو یہ سب بلکہ اس سے بھی بڑھ کر بہت کچھ جائز وروا ہوتا ہے۔ اس لیئے ضروری ہے کہ اسے بیرون خانہ زندگی سے جوڑا جائے۔ کیونکہ یہی وہ صورت ہے جو ہمیں کسی بھی ابہام اور مغالطے سے بچاتی ہے۔ آیت میں زینت کا لفظ تین مرتبہ آیا ہے۔

پہلی مرتبہ: ولا یبدین زینتھن الا ما ظھر منھا

دوسری مرتبہ: ولا یبدین زینتھن الا لبعولتھن

تیسری مرتبہ: ولا یضربن بارجلھن لیعلم ما یخفین من زینتھن

اول الذکر دونوں جملوں میں زینت کا لفظ ایک ہی معنی میں استعمال ہوا ہے اس فرق کے ساتھ کہ غیر محرموں کے سامنے ارادۃً ابداءِ زینت ممنوع ہے اور محارم کے سامنے ارادۃً جائز۔ جبکہ مؤخر الذکر جملہ میں زینت کا تعلق بیرون خانہ زندگی سے ہے۔ اس لیے عورتوں کو محض زینت کے اظہار سے روکا گیا ہے۔

چوتھی دلیل: فلا تخضعن بالقول فیطمع الذی فی قلبہ مرض وقلن قولا معروفا۔

(الاحزاب/۳۲)

پس (اے نبی کی عورتو!) غیر محارم سے گفتگو کے دوران تم اپنی آواز میں نرمی اور لوچ نہ پیدا ہونے دو، مبادا کہ جسکے دل میں (جنسی وعشقی روگ) کی بیماری ہے وہ طمع کرنے لگے۔ ہاں مناسب اور موزوں گفتگو (ضرور) کرو۔

اس آیت سے عموماً یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ عورت کے چہرے کا پردہ کیوں ضروری نہ ہو۔ اس کی تو آواز کا بھی پردہ ہے مگر آپ دیکھیے کہ آیت مبارکہ سے یہ استدلال کس قدر غلط ہے۔ آیت میں تو عورتوں کو ایسا طرز خطاب اختیار کرنے سے روکا گیا ہے جو کمزور اعصاب یا غلط کردار والوں کے لیے موجب فتنہ ہو سکتا ہو۔ مطلق بات کرنے سے کہاں روکا گیا ہے۔ وقلن قولا معروفا کے حکم نے اس مسئلہ کو بالکل واضح کر دیا ہے۔

پانچویں دلیل: وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاھلیۃ الاولی۔(الاحزاب/۳۳)

اور اپنے گھروں میں ٹھہری رہو اور پہلی جاہلیت کی طرح بناؤ سنگھار نہ دکھاتی پھرو۔

تبرج کا مطلب ہے حسن کو نمایاں کر کے دکھانا یعنی بے تکلف ان محاسن کا اظہار جنکا چھپانا واجب ہے۔ (روح المعانی) عورتوں کا ناز وانداز سے چلنا پھرنا بھی تبرج ہے۔ الغرض یہ ایسا اظہار زینت ہے جس سے مردوں کی شہوت نفسانی کو مہمیز کیا جائے (لسان العرب)

آیت میں ازواج النبی کو بالخصوص اور عام عورتوں کو بالعموم دو احکام دیے گئے ہیں۔

۱۔ گھروں میں وقار سے رہنا، سکون سے رہنا

۳۔ آوارگی والا بناؤ سنگھار کر کے گھروں سے باہر نہ نکلنا۔

گویا گھروں میں رہنے اور جاہلیت اولیٰ کے بناؤ سنگھار سے روکنے کو ایک جگہ جمع کرنے سے مقصود یہ ہے کہ عورتوں کے گھروں سے باہر نکلنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ بشرطیکہ ان کا نکلنا ایسا نہ ہو۔ جس سے معاشرہ میں بے حیائی، عریانی، آوارگی اور فحاشی کو فروغ ملے۔ مطلب یہ کہ قرآن نے فقط تبرج (یعنی بناؤ سنگھار) سے نہیں روکا بلکہ جاہلیت اولیٰ کے تبرج سے روکا ہے۔ اور وہ یہ تھا کہ عورتیں باریک لباس پہن کر نکلتیں یا ایسے کپڑے پہنتیں کہ جس سے جسم کے اکثر حصے نمایاں نظر آتے اور یوں وہ مردوں کے لئے وجہ شہوت بن جاتیں۔

ہمارے مفسرین نے جاہلیت اولیٰ کے تبرج کی تمثیل یورپین عورتوں سے کی ہے۔ ان کے بقول جس طرح وہ نیم برہنہ لباس پہنتی ہیں۔ عرب کی جاہلیت اولیٰ کا لباس بھی کم وبیش ویسا ہی تھا۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے الفاظ میں "عرب جاہلیت کی عورتوں میں ویسی ہی آزادی تھی، جیسی اس وقت یورپ میں ہے"۔(۹)

چھٹی دلیل: لا یحل لک النسآء من بعد ولا ان تبدل بھن من ازواج ولو اعجبک حسنھن۔ (الاحزاب/۵۲)

اس کے بعد آپ کے لیے اور عورتیں نکاح میں لانا جائز نہیں اور نہ یہ کہ آپ ان کی جگہ دوسری بیویاں بدل لیں۔ خواہ ان کا حسن آپ کو کتنا ہی اچھا کیوں نہ لگے۔

حسن کے تعجب خیز ہونے کا انحصار بظاہر چہرے مہرے کو دیکھنے کے بعد ہی ممکن ہے۔ اگر کسی کا چہرہ مستور ہو تو اسکے حسن کا پتہ نہیں چل سکتا جبکہ اس آیت میں آنحضرت ﷺ کو مخاطب کر کے جو بات فرمائی گئی ہے اس کا پورا ہونا کھلے چہرے کے ساتھ ہی ممکن تھا۔ اس لیے ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ چہرہ کھلا رکھنا اسلامی شریعت کا تقاضا ہے۔ یا کم از کم جائز و روا ضرور ہے۔ اگر کوئی کھلے چہرے کو خلاف اسلام بتاتا ہے تو گویا وہ خدا کی شریعت میں کوئی نقص تلاش کر کے اسے ٹھیک کرنے کی کوشش کرنا چاہتا ہے۔

ساتویں دلیل: واذا سالتموھن متاعا فسئلوھن من وراء حجاب۔ (الاحزاب/۵۳)

اور جب تم (اے مسلمانو!) ان سے (یعنی ازواج النبی ﷺ سے) کوئی چیز مانگو تو پردے کے پیچھے سے مانگو۔

اس آیت میں حجاب، کا لفظ قابل توجہ ہے۔ عورت اپنے چہرے کو چھپانے کے لیے جس نقاب کو استعمال کرتی ہے بالعموم اسے حجاب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مگر آپ دیکھئے کہ یہاں حجاب کا لفظ نقاب کے معنی میں استعمال نہیں ہوا۔ (۱۰) بلکہ گھر کے دروازے پر پڑے ہوئے اس کپڑے کے لیے استعمال ہوا ہے جو باہر سے اندر آنے والوں کے لیے ایک روک پیدا کر دیتا ہے کہ وہ یونہی دراتے ہوئے اندر نہ آجایا کریں۔ مزید یہ کہ من ورآء حجاب کا حکم دراصل نامحرم لوگوں کو گھروں کے اندر (بغیر اجازت) داخل ہونے سے روکنے کے لیے آیا ہے نہ کہ عورتوں کو گھروں سے باہر نکلنے سے روکنے کے لیے۔ اس لیے اس سے چہرے کے پردے کا جواز کا کوئی تک نہیں بنتا۔

یہی وجہ ہے کہ اس حکم کے بعد بھی ازواج مطہرات، رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جنگوں میں شریک ہوتی رہیں بعض صحابہ کی ازواج اپنے ضروری کاروبار کرتی رہیں۔ عورتیں مسجدوں میں نمازوں کے لیے حاضر ہوتی رہیں۔ کھیت وکھلیان میں مردوں کی معاونت کرتی رہیں۔ وعظ ونصیحت کے اجتماعات میں شریک ہوتی رہیں۔(۱۱)

انتہا پسند مذہبی طبقوں کی خواتین میں آج جس نوعیت وہیئت کا پردہ رواج پا چکا ہے اس پردے کے ساتھ یہ ناممکن لگتا ہے کہ کوئی عورت کاروبار کر سکے، کسی ہنگامی حالت میں بطور معاون مردوں کی شریک ہو سکے۔ ہنگامی وایمرجنسی کے حالات میں ضرورت مندوں کی مدد کے لیے گھر سے باہر نکل سکے۔ کسی جنگ میں شریک ہو سکے، اجنبی مجاہدین کے لیے کھانا تیار کر سکے۔ زخمیوں کو پانی پلا سکے اور بوقت ضرورت انکی نرسنگ کر سکے۔

آٹھویں دلیل: یا ایھا النبی قل لازواجک وبنٰتک ونسآء المومنین یدنین علیھن من جلابیبھن ذلک ادنیٰ ان یعرفن فلا یوذین۔ (الاحزاب/۵۹)

اے نبی! اپنی بیویوں اور اپنی بیٹیوں اور مومنوں کی عورتوں سے کہہ دیجئے کہ وہ (گھر سے باہر نکلتے وقت) اپنی چادروں کا ایک حصہ اپنے سروں پر بھی لے لیا کریں یہ چادر لینا اس امر کے قریب ہے کہ اس طرح ان کی پہچان ہو جائیگی اور وہ (عدم معرفت کی) اذیت سے بچ جائیں گی اور وہ ایذا نہیں دی جائیں گی۔

اس آیت سے چہرے کے پردے کے حق میں استدلال کیا جاتا ہے۔ مگر آیت میں اس کے برعکس استدلال کا لوازمہ موجود ہے۔ یدنین علیھن میں چادروں کا سروں سے اوپر لینے کا حکم اس امر کو کب

مستلزم ہے کہ اس سے چہرہ بھی چھپایا جائے گا۔ جبکہ ذلک ادنیٰ ان یعرفن کے فقرہ میں عورت کی شناخت کا قرینہ واضح طور پر موجود ہے۔ اور کسی عورت کی پہچان اور معرفت، چہرے کو چھپا کر کیسے ممکن ہے؟

قرآن جلباب کو اس طرح اوپر لینے کا حکم دے رہا ہے کہ جس سے عورت کا سر اور باقی بدن تو چھپ جائے مگر چہرہ کھلا رہے تاکہ عورت کی شناخت ہو سکے کہ وہ کون ہے؟ لسان العرب میں جلباب کے تعلق سے لکھا گیا ہے۔ الجلباب ثوب اوسع من الخمار ودون الرداء تغطی بہ المرأۃ راسھا وصدرھا۔ یعنی جلباب اوڑھنی سے بڑا اور عبا سے چھوٹا ایک کپڑا ہے جس سے عورت اپنا سر اور سینہ ڈھانپتی ہے۔

بعض لوگوں نے من جلابیبھن میں من کو تبعیضیہ قرار دے کر گھونگھٹ نکالنے کا مفہوم اخذ کیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ مفہوم ان کا خود ساختہ ہے۔ من تبعیضیہ کا مطلب ہے کہ جلباب کے ایک حصے سے سر کو ڈھانپا جائے۔ اگر من تبعیضیہ سے چہرہ ڈھانپنا مراد لیا جائے تو ان یعرفن کا لفظ بے محل ہو جائے گا۔ اور ویسے بھی قرآن کی دیگر آیات سے بالعموم چہرے کے کھلے ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ اس لیے من تبعیضیہ کا مفہوم گھونگھٹ نکالنے سے کرنا دیگر آیات کی تفہیم میں خلل واقع کرتا ہے۔

آیت میں چونکہ ادنائے جلباب کا حکم اس لیے دیا گیا ہے۔ کہ اس سے عورتوں کی شناخت ہو۔ شناخت کا ایک پہلو یہ ہے کہ عورتوں کے سروں پر بڑی چادریں دیکھ کر دیکھنے والوں کو دور سے ہی اندازہ ہو جائے کہ یہ مسلم خواتین ہیں۔ شناخت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جلباب سے ان کے چہرے چھپے نہ ہوں تاکہ معلوم ہو سکے کہ وہ کون ہیں؟ خدانخواستہ کہیں مجرم تو نہیں، اس طرح مشکوک اور مجرم عورتوں کو اپنے چہرے چھپا کر بھاگ نکلنے کا موقع نہ مل سکے گا۔ واضح رہے کہ مومن عورتوں کی پہچان فقط چادروں سے نہیں ہوتی بلکہ چادروں کے ساتھ ساتھ ان کے چہروں پر ظاہر ہونے والے اس نور حیا سے بھی ہوتی ہے۔ جو ان کے نیک چلن کی آئینہ داری کرتا ہے اور اس نور حیا کی برکت سے وہ لوگوں کے چھیڑ چھاڑ اور بدنظری کی اذیت سے محفوظ رہتی ہیں۔

چہرے انسانی ذات کے آئینہ دار ہوتے ہیں اور چہروں سے بھی انسانوں کی شناخت ہوتی ہے۔ اس لیے مناسب سمجھتا ہوں کہ چہروں کے ذریعہ تعارف ہونے کے کچھ قرآنی دلائل بھی پیش کر دوں ملاحظہ کیجئے۔

(۱) تعرف فی وجوھھم نضرۃ النعیم۔ (المطففین/۲۴)

آپ ان کے چہروں سے ہی نعمت و راحت کی رونق و شگفتگی معلوم کر لیں گے۔

آیت میں اہل جنت کا ذکر کرتے ہوئے جس امر کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس میں تعرف فی وجوھھم کے الفاظ قابل توجہ ہیں۔ انمیں معرفت کا سبب کھلے چہروں کو بتایا گیا ہے۔ اس لیئے کہ ملفوف چہروں سے رونق و شگفتگی معلوم نہیں ہو سکتی۔ واضح رہے کہ اہل جنت کے الفاظ مرد و عورت دونوں کے لیے یکساں استعمال ہوتے ہیں۔ لہٰذا یعرفن کا سبب بھی کھلے چہرے کو قرار دیا جائیگا نہ کہ ملفوف چہرے کو۔

چہرے کے ذریعہ معرفت ہونے پر ایک اور دلیل ملاحظہ کیجئے۔

(۲) واذا تتلی علیھم اٰیاتنا بینت تعرف فی وجوہ الذین کفروا المنکر۔ (الحج/۷۲)

اور جب ان پر ہماری آیتیں پیش کی جاتی ہیں تو تو ان کافروں کے چہروں پر انکار دیکھے گا۔

واضح ہو کہ الذین کفروا سے مراد فقط مرد نہیں ہوتے بلکہ علی سبیل التغلیب کے قانون سے خواتین بھی مراد ہوتی ہیں۔ آیات الٰہی، تلاوت کرنے یا پیش کرنے کے بعد مرد و عورت ہر دو کا فوری ردعمل ان کے چہروں سے ہی ظاہر ہوتا ہے۔ قرآن نے اس حقیقت کو یہاں بیان کیا ہے۔ آخر ملفوف چہرے کسی کے انکار کو کیسے ظاہر کر سکتے ہیں۔

چہرے اور معرفت کے باہمی تعلق پر ایک اور آیت دیکھیے۔

(۳) سیما ھم فی وجوھھم من اثر السجود۔ (الفتح/۲۹)

ان کا نشان ان کے چہروں پر سجدوں کے اثر سے (ظاہر) ہے۔

رسول اللہ ﷺ اور ان کا ساتھ دینے والوں کے اوصاف میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ کفار کے مقابلہ میں زیادہ قوی اور اپنے لوگوں میں شفیق و مہربان ہونے کے ساتھ ساتھ رکوع و سجود کے خوگر اور اللہ تعالیٰ کے فضل و رضوان کے متمنی ہوتے ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں کہ جن کے چہرے پر نور اور بارونق نظر آتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان خوبیوں کے مالک صرف مرد نہیں ہوتے بلکہ عورتیں بھی ان خوبیوں کی مالک ہوتی ہیں۔ اس آیت میں مذکورہ بالا فقرہ سے قبل مذکور یہ جملہ بھی قابل توجہ ہے۔

ترھم رکعا سجدا یبتغون فضلا من اللہ ورضوانا۔ (الفتح/۲۹)

تو انہیں رکوع و سجود کرتے دیکھتا ہے وہ اپنے رب کا فضل اور اسکی خوشنودی کے طلب گار ہیں۔

تسرھم میں تو انہیں دیکھتا ہے یا دیکھے گا کے الفاظ پر نظر رہے اور وجوھھم پر بھی نظر رہے تو ہمارا مدعا بآسانی سمجھ میں آجائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ یہاں چہروں کو دیکھنے کی بات ہو رہی ہے اور پر نور چہرے صرف مردوں کے نہیں ہوتے عورتوں کے بھی ہوتے ہیں۔ یہاں بھی مذکر کا صیغہ تغلیب کے قاعدہ کے مطابق لایا گیا ہے۔ ذلک ادنیٰ ان یعرفن کی معنویت اور مقصدیت ان آیات کی مدد سے بآسانی سمجھ

میں آسکتی ہے۔

اس ضمن میں ایک اور آیت دیکھ لیجئے۔

(۴) تعرفھم بسیماھم ۔ (البقرہ / ۲۷۳)

تم انہیں ان کی صورت سے پہچان لوگے۔

سیما کے معنی علامت اور نشان کے ہوتے ہیں مگر یہاں یہ چہرہ اور صورت کے معنی میں آیا ہے کیونکہ کسی کی صورت اور شکل دراصل اسکی شناخت اور علامت ہوتی ہے یعنی کوئی بھی شخص (خواہ وہ مرد ہو یا عورت) اپنی صورت سے ہی پہچانا جاتا ہے۔

اور اب اس سلسلے کی آخری آیت ملاحظہ ہو۔

(۵) یعرف المجرمون بسیماھم۔(الرحمٰن/۴۱)

مجرمین اپنے چہروں سے پہچانے جائیں گے۔

یہاں بھی مجرموں کی شناخت کے لیے ان کی صورتوں اور چہروں کو متعین کیا گیا ہے۔ جس سے ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ بغرض شناخت چہروں کا کھلا ہونا عقل وفطرت اور شریعت کے عین مطابق ہے۔

ان پانچوں آیتوں سے واضح ہوتا ہے کہ چہرہ آدمی کی شناخت اور معرفت کا ذریعہ ہے اس لیے ذلک ادنی ان یعرفن فلا یوذین کا مفہوم اپنے محل پر اس وقت صحیح بیٹھ سکتا ہے۔ جب وہ قابل شناخت ہو اور شناخت کے لیے اس کا کھلا ہونا ضروری ہے۔

اور اب پچھلی شریعتوں اور قوموں کے حوالے سے کچھ نکات ملاحظہ کیجئے۔ جن سے عورتوں کی درون خانہ و بیرون خانہ ہر دو زندگیوں کا سراغ ملتا ہے۔ ان نکات سے ہم اپنی معاشرت آسائی کے لیئے بہت کچھ اخذ کر سکتے ہیں۔

قرآن میں آتا ہے:

فلما رآ ایدیھم لا تصل الیہ نکرھم واوجس منھم خیفۃ ، قالو لا تخف انا ارسلنا الی قوم لوط۔ وامراتہ قائمۃ فضحکت فبشرنھا باسحق ومن ورآء اسحق یعقوب ۔ قالت یویلتی ء الد وانا عجوز وھذا بعلی شیخا ان ھذا لشیء عجیب۔(ھود/۷۰۔۷۲)

پھر جب (ابراہیم علیہ السلام نے) دیکھا کہ انکے ہاتھ اس (کھانے) کی طرف نہیں بڑھ رہے تو انہیں اجنبی سمجھا اور اپنے دلمیں ان سے کچھ خوف محسوس کرنے لگے۔ انہوں نے کہا آپ مت

ڈریئے! ہم قوم لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ اور انکی اہلیہ (سارہ پاس ہی) کھڑی تھیں تو وہ ہنس پڑیں سو ہم نے ان (کی زوجہ) کو اسحاق اور اسحٰق کے بعد یعقوب کی بشارت دی وہ کہنے لگیں! وائے حیرانی کیا میں بچہ جنوں گی حالانکہ میں بوڑھی (ہو چکی) ہوں اور میرے یہ شوہر (بھی) بوڑھے ہیں۔ بے شک یہ تو بڑی عجیب چیز ہے۔

ان آیات کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور انکی اہلیہ کے ہاں کچھ مرد حضرات آئے۔ جنہیں ابراہیم علیہ السلام نے اپنا مہمان بنایا پھر ان کی خاطر مدارات اور ضیافت و مہمانی میں مصروف ہو گئے۔ اس خدمت میں وہ تنہا نہ تھے بلکہ انکی اہلیہ حضرت سارہ بھی برابر کی شریک رہیں۔ وہ نہ صرف انکی خدمت و مہمانی میں کھڑی ہوئیں بلکہ ان سے محو گفتگو بھی ہوئیں۔

ان آیات میں پیغمبر کی موجودگی میں انکی اہلیہ کا اجنبیوں کے سامنے کھڑا ہونا اور ان سے تکلم فرمانا کیا عورتوں کے اسلامی پردے کی اصل حقیقت کو واضح نہیں کر رہا کہ عورتوں کا اجنبی مردوں کے سامنے آجانا اور کبھی اور ان سے ہم کلام ہونا کبھی امر ممنوع نہیں رہا ہے۔

وقالت لاختہ قصیہ فبصرت بہ عن جنب و ھم لا یشعرون۔(القصص/۱۱)

اور (موسیٰ کی ماں نے) ان کی بہن سے کہا کہ ان کا حال معلوم کرنے کے لیے ان کے پیچھے پیچھے جاؤ۔ پس وہ انہیں دور سے (پیچھا کرتے ہوئے) دیکھتی رہی اور وہ لوگ اس امر سے بالکل بے خبر رہے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ تنہا لڑکی کسی امر ضروری کے لیئے گھر سے باہر نکل سکتی ہے۔ نہ صرف باہر بلکہ بہت دور تک بھی جا سکتی ہے۔ اور جاسوسی کے فرائض بھی انجام دے سکتی ہے۔ کیا یہ واقعہ عورتوں کے مقفل رکھے یا رہنے کے خلاف بطور دلیل کے نہیں ہے۔

فقالت ھل ادلکم علی اھل بیت یکفلونہ لکم وھم لہ ناصحون ۔(القصص/۱۲)

موسیٰ کی بہن نے کہا کیا میں تمہیں ایسے گھر والے بتاؤں جو اسے تمہارے لیے پرورش کریں اور وہ اسکے خیر خواہ ہوں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بمشیرہ موسیٰ علیہ السلام فرعون کے دربار میں تنہا پہنچی ہیں، اور وہاں موسیٰ علیہ السلام کو انکی والدہ کی آغوش میں واپس لانے کی تدبیر بھی کر رہی ہیں۔ یہ ہے عورت کا وہ کردار جو قرآن بتا رہا ہے دوسری طرف قرآن سے لاعلمی کے سبب بعض انتہا پسندوں نے عورتوں کے گھروں سے

باہر نکلنے پر ہی پابندی عائد کر رکھی ہے۔ اور ستم بالائے ستم اسے دینی تقاضا بھی سمجھا ہوا ہے۔

ووجد من دونهم امراتين تذودان۔ (قصص/۲۳)

(موسیٰ علیہ السلام نے) مردوں سے الگ ایک جانب دو بالغ لڑکیاں دیکھیں، جو (اپنے مویشیوں کو) روکے ہوئے تھیں۔

اس ٹکڑے سے پتہ چلا کہ بوقت ضرورت، عورتیں اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے مردوں کے ہجوم کے باوجود اپنے فرائض کی انجام دہی کے لیے گھر سے باہر آ جا سکتی ہیں۔

قال ما خطبكما۔ (قصص/۲۳)

موسیٰ علیہ السلام نے ان سے پوچھا کہ تم دونوں کا کیا معاملہ ہے؟ یعنی کیسی کھڑی ہو؟

اس ٹکڑے سے کسی اجنبی مرد کا اجنبی عورتوں سے گفتگو کرنا ثابت ہوتا ہے۔

قالتا لا نسقي حتى يصدر الرعاء وابونا شيخ كبير۔ (قصص/۲۳)

وہ دونوں بولیں کہ ہم (اپنے مویشیوں کو) پانی نہیں پلا سکتیں۔ یہاں تک کہ چرواہے نہ چلے جائیں اور یہ کہ ہمارے والد بہت بوڑھے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ وہ یہ کام خود انجام نہیں دے سکتے۔ اس لیے ہمیں نکلنا پڑتا ہے اس جملہ سے بالغ لڑکیوں کا کسی اجنبی مرد سے کلام کرنا یا انہیں اپنے مسائل سے آگاہ کرنا معلوم ہوتا ہے۔ عورت کی مطلق آواز کو پردہ قرار دینے والے اس آیت پر غور فرمائیں۔

فجاءته احدهما تمشي على استحياء قالت ان ابي يدعوك ليجزيك اجر ما سقيت لنا۔ (قصص/۲۵)

پھر (تھوڑی دیر بعد) ان کے پاس ان دونوں میں سے ایک (لڑکی) آئی جو شرم و حیا (کے انداز) سے چل رہی تھی۔ اس نے کہا میرے والد آپ کو بلا رہے ہیں تاکہ وہ آپ کو اس کام کا معاوضہ دیں۔ جو آپ نے ہمارے لیے (مویشیوں کو) پانی پلایا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی اجنبی مرد کو تنہا ایک جوان لڑکی بھی اپنے گھر آنے کی دعوت دینے کے لیے اپنے گھر سے باہر نکل سکتی ہے۔ واضح ہو کہ اکثر مفسرین کے نزدیک یہ ایک پیغمبر کی بیٹی تھی، جو اپنے والد کے حکم سے تنہا دعوت دینے آئی تھی۔

قرآن نے اس لڑکی کی چال کو حیادار قرار دیا ہے۔ (تمشي على استحياء) جس سے

اس کا نیک اور پاکیزہ کردار ہونا ثابت ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عورتوں کا غیر مردوں سے گفتگو کر لینا ان کے ساتھ اکیلے کچھ راستہ طے کر لینا ان کی نیکی اور پاکیزگی کا نقص نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ اتنا اعتماد اس لڑکی میں ہو سکتا ہے کہ جو مردوں کے درمیان پہلے سے نکلتی رہی ہو۔ جو لوگ اپنی عورتوں کو گھروں میں مقفل رکھتے ہیں انکی عورتوں میں اس اعتماد کا فقدان نظر آتا ہے۔

ملکہ سبا بلقیس، حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعوت پر جب انکی سلطنت میں داخل ہوئی تو کیا اسکے چہرے پر کوئی نقاب تھا؟ ہرگز نہیں، بلکہ وہ بغیر نقاب کے تھی۔ ظاہر ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسے اس حالت میں رہنے بھی دیا ہوگا۔ اس کی دعوت و مہمانی میں ارکان سلطنت کے ہمراہ اس کے ساتھ ایک قابل لحاظ وقت بھی گزارا ہوگا۔ اس دو طرفہ ملاقات میں مختلف امور بھی زیر بحث آئے ہوں گے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ان امور میں چہرے کے پردہ کا مسئلہ اور عورتوں کے گھروں سے باہر نکلنے کا مسئلہ بھی زیر غور آیا ہوگا؟ (ذرا سوچیے)

یا مریم اقنتی لربک واسجدی وارکعی مع الراکعین۔ (آل عمران/۴۳)

اے مریم! اپنے رب کی فرمانبرداری کر اور سجدہ کر اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کر (یعنی با جماعت نماز ادا کر)

آیت کریمہ کے مطابق حضرت مریم علیہ السلام کی تربیت مردانہ ماحول (ہیکل) میں ہوئی تھی۔ وہ ہیکل کے لیے وقف کی گئی تھیں اور وہیں پلی بڑھی تھیں۔ حضرت مریم بچپنے سے بلوغ بلکہ بلوغ کے بعد بھی حضرت زکریا علیہ السلام کی نگرانی میں رہیں۔ اور ہیکل کے مردانہ ماحول میں رہنے کے باوجود، مقام اصطفیٰ کو پا گئیں۔ حضرت مریم کے حالات تمام عورتوں کے لیے نمونہ کامل کا درجہ رکھتے ہیں۔ اگر عورتیں روحانی پاکیزگی کی سچی طلب گار ہوں تو خالص مردانہ ماحول بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑتا بلکہ ان پر خوشگوار اور مثبت اثر ڈالتا ہے۔

فاتت به قومها تحمله قالوا يا مريم لقد جئت شيئا فريا (مریم/۲۷)

پھر (مریم) اسے سوار کیے یا اٹھائے ہوئے اپنی قوم کے پاس آئیں انہوں نے کہا اے مریم! تو ایک عجیب چیز لائی ہے۔

غور کیجئے! حضرت مریم علیہا السلام اگر اپنے چہرے کو چھپائے ہوئے ہوتیں تو ان کی قوم یا بستی انہیں کیسے پہچان سکتی تھی؟ لامحالہ ماننا پڑے گا کہ ان کا چہرہ لوگوں کے لیئے مانوس و معروف تھا۔ اور وہ اس موقع پر بھی کھلے چہرہ کے ساتھ ہی آئی ہوں گی تبھی تو انہوں نے مریم کو پہچان لیا اور محو کلام ہوئے۔

عورتوں کے گھروں میں رہنے اور باہر نہ نکلنے کے حکم کا تعلق دراصل ان کے اعمال و کردار سے جڑا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ قرآن نے فاحشہ عورتوں کو گھروں میں محبوس و مقید رکھنے کا حکم دیا ہے۔

والٰتی یاتین الفاحشه من نسآئکم فاستشهدوا علیهن اربعة منکم فان شهدوا فامسکو هن فی البیوت حتی یتوفهن الموت او یجعل الله لهن سبیلا۔ (النساء ۱۵)

اور تمہاری عورتوں میں سے جو بے حیائی کا ارتکاب کریں تو اپنوں میں سے ان کے خلاف چار گواہ لاؤ، پھر جب وہ گواہی دیں (اور ان کے خلاف گواہی ثابت ہو جائے) تو (بطور سزا کے) انہیں گھروں میں بند کر دو۔ (یعنی ان کے باہر نکلنے پر پابندی لگا دو گویا وہ اس لائق ہی نہیں رہیں کہ گھروں سے باہر نکل سکیں) یہاں تک کہ ان کو موت آجائے یا اللہ ان کے لیئے کوئی راستہ نکال دے۔

اس آیت نے نفس مسئلہ کو بالکل صاف کر دیا ہے وہ یہ کہ عورتیں جب تک باکردار اور دیندار رہیں اس وقت تک انہیں باہر نکلنے کی پوری آزادی حاصل رہنی چاہیے۔ جونہی وہ مشکوک کردار یا بدکرداری میں ملوث نظر آئیں تو ان کی نقل و حرکت پر پابندی لگا دینی چاہیے۔ اگر معاملہ صاحب البیت تک کا ہے تو اسے گھریلو سطح پر حل کر لینا چاہیے یعنی گھر میں ہی منتقل کر دینا چاہیے اور اگر معاملہ عدالت تک پہنچ گیا ہے تو عدالت انہیں کسی بھی مکان (جیل) میں محبوس کر سکتی ہے۔

آخر میں عرض ہے کہ عورتوں کا ہر حال میں اپنے چہرے چھپا کر نکلنے پر اصرار کرنا، اسلام نہیں ہے بلکہ مذہب کے نام پر غیر معتدل اور شدت پسندانہ طرز عمل ہے جس سے اسلام کی معقولیت پر حرف آتا ہے۔ اور اس انتہا پسندانہ طرز عمل سے اسلام بھی بدنام ہوتا ہے۔ خلاصۃً ہم اپنے موقف کا اعادہ بایں الفاظ کرنا چاہیں گے۔

۱۔ عورتیں کھلے چہروں کے ساتھ باقی بدن چھپا کر باہر نکل سکتی ہیں۔

۲۔ اجنبی مردوں سے عند الضرورت محو کلام ہو سکتی ہیں۔

۳۔ بیرون خانہ ضروری امور کی انجام دہی کے لیئے تنہا سفر کر سکتی ہیں۔

مگر یہ مستحضر رہے کہ (مردوں کی طرح) غض ابصار اور حفظ فروج کی پابندی ان پر فرض اور خاتون ہونے کے ناطے خمر جیوب اور ادنائے جلباب اپنی مطلوب معنویت کے ساتھ ان پر لازم ہے۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ تبیان القرآن، جلد ہشتم ص ۱۳۹، فرید بک اسٹال، اردو بازار، لاہور، طبع اول ۲۰۰۲ء

۲۔ عرفان القرآن مطبوعہ ۲۰۰۶ء، منہاج القرآن پبلی کیشنز، لاہور۔ ۳۶۵، ایم۔ ماڈل ٹاؤن، لاہور

۳۔ تدبر قرآن جلد پنجم ص ۳۹۷، مطبوعہ ۱۹۸۶ء، فاران فاؤنڈیشن، ۱۳۲۔ فیروز پور روڈ۔ اچھرہ، لاہور

۴۔ الجزء الثامن عشر ص ۱۳۰۔ مکتبہ امدادیہ ملتان۔ سن اشاعت درج نہیں

۵۔ ایضا

۶۔ روح المعانی ص ۱۳۱

۷۔ جامع البیان، جلد ۱۸، ص ۱۵۸، مطبوعہ ۱۴۱۵ھ، دار الفکر بیروت

۸۔ یہاں باندیوں کی تخصیص نے غلاموں کو خارج کر دیا ہے۔ جس کا صاف اور صریح مطلب ہے کہ عورتیں اپنی زینتوں کو اپنے غلاموں کے سامنے بھی بالارادہ ظاہر نہیں کر سکتیں۔ پردہ کے معاملہ میں وہ غیر محارم کے حکم میں ہیں۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ عورتیں اپنے غلاموں کے سامنے بے محابا اور بے تکلفانہ آ جا سکتی ہیں اور بالارادہ زینت کا اظہار بھی کر سکتی ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ جائز نہیں ہے۔

۹۔ پردہ ص ۲۳۸، اسلامک پبلی کیشنز (پرائیوٹ) لمیٹڈ، ۱۳۔ ای شاہ عالم مارکیٹ، لاہور۔ اشاعت نمبر ۲۷۔ ۱۹۹۶ء

۱۰۔ نہ صرف اس جگہ بلکہ پورے قرآن میں کسی بھی جگہ حجاب بمعنی نقاب نہیں آیا۔ حجاب کا لفظ پورے قرآن میں پانچ مرتبہ آیا ہے۔ اور وہ مقامات یہ ہیں۔ الاعراف ۴۶/۷۔ الاحزاب ۵۳/۳۳، ص ۳۲/۳۸۔ فصلت ۵/۴۱، الشوریٰ ۵۱/۴۲۔

۱۱۔ بخاری کی روایت ہے کہ مذکورہ بالا آیت کے نزول کے بعد آنحضرت ﷺ نے اپنی ازواج سے فرمایا تھا۔ قد اذن الله لکن ان تخرجن لحوائجکن تمہیں اپنی ضروریات کے لیے باہر نکلنے کی اجازت ہے۔ مطلب یہ کہ اس آیت سے کہیں اخذ نہ کر لینا کہ عورتوں کے باہر نکلنے پر پابندی لگا دی ہے۔ آیت میں ایسا کچھ نہیں ہے۔ (بخاری باب خروج النساء لحوائجھن وفی ھذا المعنی حدیث فی المسلم، باب اباحۃ الخروج النساء لقضاء حاجۃ الانسان)

....

نقطہ نظر

حدود قوانین

جسٹس ایس اے رہانی
سابق جج سندھ ہائی کورٹ اور فیڈرل شریعت کورٹ

نفاذ حدود اللہ کے بارے میں آج پوری قوم انتشار کا شکار اور تقسیم نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ قرآنی احکام کی تعبیر اور تشریح میں ابہام اور ایسا کرنے والوں سے انفرادی عقیدت ہے۔ قرآن کی مقرر کردہ سزاؤں کے نفاذ کے سلسلے میں یہ اصول جسے بغیر کسی سوال کے مان لیا گیا ہے وہ ان سزاؤں کے لئے طریقہ ثبوت اور گواہوں کی تعداد کے بارے میں ہے۔ اس کے مطابق ایسی قرآنی مقرر کردہ سزا کے لیے زنا کے ہر کیس میں چار عینی گواہ لازمی ہیں۔ اس اصول کے ثبوت کے لیے مندرجہ ذیل قرآنی آیتوں پر انحصار کیا جاتا ہے۔

والتی یاتین الفاحشة من نسائکم فاستشهدوا علیهن اربعة منکم ، فان شهدوا فامسکوهن فی البیوت حتی یتوفهن الموت او یجعل الله لهن سبیلا. (النساء : ۱۵)

اور جو ارتکاب کریں تمہاری عورتوں میں سے تو گواہی لاؤ ان پر چار مردوں کی اپنوں میں سے، پھر اگر گواہی دے دیں وہ تو قید رکھو ان عورتوں کو گھروں میں حتیٰ کہ آ جائے انہیں موت یا نکالے اللہ ان عورتوں کے لیے کوئی اور سبیل۔

والذن یاتینها منکم فاذوهما فان تابا واصلحا فاعرضوا عنهما ان الله کان توابا رحیما۔ (النساء : ۱۶)

اور جو دو مرد ارتکاب کریں بدکاری کا تم میں سے تو اذیت دو ان کو (جسمانی اور ذہنی) پھر اگر توبہ کر لیں دونوں اور اپنی اصلاح بھی کر لیں تو پیچھا چھوڑ دو ان کا۔ بے شک اللہ ہے بہت توبہ قبول کرنے والا اور رحم

کرنے والا۔

الزانیه والزانی فاجلدوا کل واحد منهما مائة جلدة ولا تاخذکم بهما رافة فی دین الله ان کنتم تومنون بالله والیوم الاخر ولیشهد عذابهما طائفة من المومنین. (النور: ۲)

زانی عورت اور زانی مرد کو کوڑے مارو ہر ایک کو ان دونوں میں سے سو سو کوڑے اور نہ دامن گیر ہو تم کو ان کے سلسلہ میں ترس کھانے کا جذبہ اللہ کے دین کے معاملے میں اگر رکھتے ہو تم ایمان اللہ پر اور روز آخرت پر اور چاہیے کہ مشاہدہ کرے ان کی سزا کا ایک گروہ مومنوں کا۔

والذین یرمون المحصنت ثم لم یاتوا باربعة شهداء فاجلدوهم ثمنین جلدة ولا تقبلوا لهم شهادة ابدا واولئک هم الفسقون. (النور : ۴:۲۴)

اور جو لوگ تہمت لگائیں پاکدامن عورتوں پر پھر نہ لا سکیں وہ چار گواہ تو کوڑے مارو انہیں اسی کوڑے اور نہ قبول کرو ان کی گواہی کبھی بھی اور یہی لوگ فاسق ہیں۔

لولا جاء و علیه باربعة شهداء فاذلم یاتوا بالشهداء فاولئک عندالله هم الکذبون. (النور: ۱۳)

کیوں نہ لائے اس الزام پر چار گواہ۔ پھر جبکہ نہیں لا سکے وہ گواہ تو یہ لوگ اللہ کے نزدیک خود ہی جھوٹے ٹھہرے۔

ایک مسلمان کو قرآن کی تعبیر اس بنیادی عقیدہ پر کرنی چاہئے کہ یہ اللہ کا کلام ہے اور اللہ تعالیٰ قادر الکلام ہے۔ اسے نہ تو زبان کا کوئی مسئلہ ہے اور نہ وہ کچھ بھولتا ہے۔ وہ جو بات جہاں اور جیسے کہنا چاہتا ہے کہہ سکتا ہے۔ نتیجہ" اللہ تعالیٰ کو جو بات جہاں اور جیسے کہنا تھی وہ صاف طور پر فرما دی گئی ہے۔ اس لیے کسی تعبیر و تشریح کرنے والے کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ یہ نکتہ نکالے کہ جو بات ایک اور جگہ اور ایک دوسرے سلسلہ میں کہی گئی ہے وہ کسی اور جگہ بھی اور کسی اور مسئلہ پر بھی لازم ہوگی۔

قرآن مجید میں زنا کی سزا کا حکم سورۃ النور کی آیت نمبر ۲ میں دیا گیا ہے۔ اس آیت میں اس سزا کے لیے طریقہ ثبوت پر کوئی شرط نہیں لگائی گئی لیکن یہ ظاہر ہے کہ سزا جب ہی دی جائے گی جب جرم ثابت ہوگا۔ اگر اللہ تعالیٰ ثبوت کے سلسلے میں کوئی مخصوص طریقہ کار دینا چاہتا تو یہاں بیان کرنے میں کوئی مشکل نہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ثبوت کے طریقہ کار کو انسانی عقل پر چھوڑ دیا ہے۔

تعبیر و تشریح کرنے والوں نے سورۃ النساء کی آیت نمبر ۱۵ کے حکم کو سورۃ النور کی اس آیت سے ملزوم کر دیا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ اس کا اطلاق زانی مرد کے جرم کے ثبوت کے لیے بھی کر دیا

ہے۔ اس کے لئے سورۃ النساء کی آیت نمبر ۱۶ کا سہارا لیا جاتا ہے۔ آیت نمبر ۱۶ کا اگر یہ مطلب بھی لیا جائے کہ یہ دو مردوں کے لیے نہیں بلکہ زانی اور زانیہ کے لیے ہے تب بھی یہ صرف دونوں کو سزا دینے کے لیے حکم ہے۔ اس میں طریقہ ثبوت کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اور نہ یہ گواہوں کی شرائط کے بارے میں کوئی اشارہ کرتی ہے۔

سورۃ النساء کی یہ دونوں آیتیں سورۃ النور کی مذکورہ بالا آیات سے پہلے ایک اور موقع پر نازل ہوئی تھیں۔ یہ واضح ہے کہ آیت نمبر ۱۵ میں عورتوں کو بے وجہ الزام تراشی سے محفوظ رکھنے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ اور اسی لیے چار گواہوں کی شرط لگائی گئی تھی۔ دوسرے اس آیت میں "فاحشہ" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جبکہ سورۃ النور کی آیت نمبر ۲ میں زانی اور زانیہ کے الفاظ آئے ہیں۔ بہر حال اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ سورۃ النور آیت نمبر ۲ کا حکم سورۃ النساء کی اس آیت کے حکم پر منحصر ہے تب بھی کسی طرح یہ نہیں کہا جا سکتا کہ زانی مرد پر سورۃ النور کی آیت نمبر ۲ کے اطلاق کے لیے چار مرد گواہوں کی شرط ضروری ہے۔ سورۃ النساء کی آیت نمبر ۱۵ مکمل طور پر عورتوں کے بارے میں ہے اور اس میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ عورتوں پر فاحشی کا الزام لگانے میں احتیاط برتی جائے اور جب تک اس میں بیان کی ہوئی شہادت یعنی چار مرد گواہ موجود نہ ہوں یہ الزام نہ لگایا جائے۔ لیکن مرد کا جرم الگ ہے اور اسے قرآنی سزا کے لیے اس ثبوت کی ضرورت نہیں ہے۔

مولانا مودودی نے "تفہیم القرآن" میں لکھا ہے کہ سورۃ النساء کی آیت نمبر ۱۵ اور ۱۶ میں دیا گیا حکم ڈھائی تین سال بعد سورۃ النور آیت نمبر ۲ کا حکم نازل ہونے پر منسوخ ہو گیا اور زنا ایک قانونی جرم قابل دست اندازی سرکار قرار دیا گیا۔ سورۃ النساء کی ان آیات کے حکم کی منسوخی کے باوجود بھی اگر چار مرد گواہوں کی شرط برقرار رہی تو وہ صرف عورتوں کے تحفظ کے لیے ہی ہو سکتی ہے۔ مرد اس کا فائدہ نہیں لے سکتے۔ کہا جاتا ہے کہ زنا بالرضا میں مرد اور عورت دونوں مل کر یہ جرم کرتے ہیں اس لیے دونوں کے جرم کے لیے ایک جیسا ثبوت ضروری ہے۔ یہ مفروضہ بے بنیاد ہے کیونکہ دونوں کا جرم الگ ہے اسی لیے دونوں کو الگ الگ سزا دی جاتی ہے۔ اگر کسی کیس میں ایسا ہو کہ زنا بالرضا کے جرم کے بعد کسی وجہ سے عورت کا انتقال ہو جائے تو اس پر کوئی کیس نہیں چلے گا۔ تو کیا مرد کو بھی بغیر کیس چلائے چھوڑ دیا جائے گا۔ اور اگر صرف اس پر کیس چلے گا تو گواہی کے سلسلے میں زانی پر ثبوت کے لیے سورۃ النساء کی آیت نمبر ۱۵ کا اطلاق کیسے کیا جا سکتا ہے۔ سورۃ النور کی آیت نمبر ۴ میں چار گواہ لانے کی شرط کا تذکرہ بھی اسی بات کی دلالت کرتا ہے یہ شرط صرف عورتوں پر الزام کے سلسلے میں ہے۔ لیکن ہماری تعبیر و تشریح

حدود قوانین	جسٹس ایس اے ربانی

کرنے والوں نے اس کا اطلاق مردوں پر الزام پر بھی کر دیا اور قذف کی حد کو مردوں پر الزام پر بھی لاگو کر دیا ہے۔ جبکہ آیت میں "یرمون المحصنت" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ یہ طے شدہ کلیہ ہے کہ مذکر کا صیغہ مونث کو بھی شامل کر سکتا ہے مگر مونث کا صیغہ مذکر کو شامل نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ اگر قذف کی حد مردوں پر الزام پر بھی نافذ کرنا چاہتا تو اس کے لیے واضح الفاظ کا استعمال کچھ مشکل نہ تھا۔ سورۃ النور کی آیت نمبر ۱۳ میں بھی چار گواہوں کا تذکرہ ہے مگر یہ بھی عورت ہی پر الزام کے سلسلے میں ہے۔

پس اگر اس عقیدے سے کہ اللہ تعالیٰ قادر الکلام ہے اور وہ بھولتا بھی نہیں ہے۔ تمام متعلقہ آیات کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ عورتوں کے خلاف فاشی کے الزام کے ثبوت کے لیے چار گواہوں کی ضرورت ہے لیکن مردوں کے خلاف ثبوت کے لیے ایسی کوئی شرط نہیں ہے۔ ثبوت کے اور مروجہ طریقے انکے لیے استعمال کیے جا سکتے ہیں۔

اسی طرح دوسرے حدود کے کیسوں میں اور قصاص کے لیے بھی دو مرد گواہوں کی شرط کی بھی کوئی قرآنی بنیاد نہیں ہے۔ مستقبل کے مالی معاہدوں پر دو مرد گواہوں کی شرط کو جرائم کے ثبوت تک پھیلا دینا منطقی طور پر غلط ہے۔ معاہدہ کے گواہ مرضی پر ہوتے ہیں جبکہ جرم کے گواہ قدرتی طور پر ہوتے ہیں اور اپنی مرضی سے مقرر نہیں کیے جا سکتے۔ ویسے بھی اگر اللہ تعالیٰ یہ مقرر کرنا چاہتا تو حدود کے تذکرے کے ساتھ واضح الفاظ میں ان کے بیان میں کیا شے مانع تھی۔

اللہ تعالیٰ نے قذف کی حد کا حکم صرف ان کے خلاف دیا تھا جو "محصنت" پر الزام لگائے۔ اس کے لیے النساء کا لفظ بھی استعمال نہیں ہوا۔ یعنی ہر قسم کی عورت پر الزام سے بھی حد قذف لازم نہیں ہوتی۔ مگر ہمارے علماء نے مردوں پر الزام پر بھی اس حد کو نافذ کر دیا۔ تعبیر کی اسی قسم کی غلطیوں کی وجہ سے اسلامی اور قرآنی احکام پر تنقید اور اعتراض کی گنجائش نکلی ہے۔

گواہوں کی ان شرائط کے اطلاق کو وسیع کر کے ہمارے تعبیر و تشریح کرنے والوں نے اللہ کی حدود کے احکام کو نا قابل عمل بنا دیا ہے اور پھر اس پر فخر کرتے ہیں کہ ان احکام پر عمل شاذ ہی ہوتا ہے۔ اس تعبیر کے ذریعے عورتوں کا گواہی کا حق چھین لیا گیا ہے۔ جس کے لیے کوئی قرآنی جواز نہیں ہے۔ قرآن کی صحیح تعبیر ہی یہ مسئلہ حل کر سکتی ہے۔

....

اُصول ترجمہ وتفسیر

مولانا ابوالکلام آزادؒ

ہر عہد کا مصنف اپنے عہد کی ذہنی آب وہوا کی پیداوار ہوتا ہے۔ اور اس قاعدے سے صرف وہی دماغ مستثنیٰ ہوتے ہیں جنہیں مجتہدانہ ذوق ونظر کی قدرتی بخشائش نے صف عام سے الگ کر دیا ہو چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں سے لے کر قرون اخیر تک جس قدر مفسر پیدا ہوئے ان کا طریق تفسیر ایک رو بہ تنزل معیار فکر کی مسلسل زنجیر ہے جس کی ہر پچھلی کڑی پہلی کڑی سے پست تر اور ہر سابق لاحق سے بلند تر واقع ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں جس قدر اوپر کی طرف بڑھتے جاتے ہیں۔ حقیقت زیادہ واضح، زیادہ بلند اور اپنی قدرتی شکل میں نمایاں ہوتی جاتی ہے۔ جس قدر نیچے اترتے آتے ہیں حالت برعکس ہوتی جاتی ہے۔

یہ صورت حال فی الحقیقت مسلمانوں کے عام دماغی تنزل کا قدرتی نتیجہ تھی۔ انہوں نے جب دیکھا کہ قرآن کی بلندیوں کا ساتھ نہیں دے سکتے تو کوشش کی کہ قرآن کو اس کی بلندیوں سے اس قدر نیچے اتار لیں کہ ان کی پستیوں کا ساتھ دے سکے۔

اب اگر ہم چاہتے ہیں کہ قرآن کو اس کی حقیقی شکل ونوعیت میں دیکھیں تو ضروری ہے کہ پہلے وہ تمام پردے ہٹائیں جو مختلف عہدوں اور مختلف گوشوں کے خارجی موثرات نے اس کے چہرے پر ڈال دیے ہیں۔ پھر آگے بڑھیں اور قرآن کی حقیقت خود قرآن ہی کے صفحوں میں تلاش کریں۔

بعض اسباب ومؤثرات جو فہم حقیقت میں مانع ہیں

یہ مخالف اثرات جو یکے بعد دیگرے جمع ہوتے رہے دو چار نہیں بے شمار ہیں اور ہر گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں ممکن نہیں کہ انتشار کے ساتھ بیان میں آسکیں۔ لیکن میں نے مقدمہ تفسیر میں کوشش کی ہے کہ انہیں چند اصول وانواع کے ماتحت سمیٹ لوں۔ اسی سلسلے میں حسب ذیل دفعات قابل غور ہیں۔

۱۔ قرآن حکیم اپنی وضع، اپنے اسلوب، اپنے انداز بیان، اپنے طریق خطاب، اپنے طریق استدلال،

غرضکہ اپنی ہر بات میں ہمارے وضعی اور صناعی طریقوں کا پابند نہیں ہے۔ اور نہ اسے پابند ہونا چاہیے۔ وہ اپنی ہر بات میں اپنا بے میل فطری طریقہ رکھتا ہے اور یہی وہ بنیادی امتیاز ہے جو انبیاء کرام علیہم السلام کے طریق ہدایت کو علم وحکمت کے وضعی طریقوں سے ممتاز کر دیتا ہے۔

قرآن جب نازل ہوا تو اس کے مخاطبوں کا پہلا گروہ بھی ایسا ہی تھا۔ تمدن کے وضعی اور صناعی سانچوں میں ابھی اس کا دماغ نہیں ڈھلا تھا۔ فطرت کی سیدھی سادی فکری حالت پر قانع تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن اپنی شکل ومعنی میں جیسا کہ واقع ہوا تھا، ٹھیک ٹھاک ویسا ہی اس کے دلوں میں اتر گیا اور اسے قرآن کے فہم ومعرفت میں کسی طرح کی دشواری محسوس نہیں ہوئی۔ صحابہ کرام پہلی مرتبہ قرآن کی کوئی آیت یا سورت سنتے تھے اور سنتے ہی اس کی حقیقت پالیتے تھے۔

لیکن صدر اول کا دور ابھی ختم نہ ہوا تھا کہ روم وایران کے تمدن کی ہوائیں چلنے لگیں اور پھر یونانی علوم کے تراجم نے علوم وفنون وضعیہ کا دور شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جوں جوں وضعیت کا شوق بڑھتا گیا، قرآن کے فطری اسلوبوں سے طبیعتیں ناآشنا ہوتی گئیں۔ رفتہ رفتہ وہ وقت آگیا کہ قرآن کی ہر بات وضعی اور صناعی طریقوں کے سانچوں میں ڈھالی جانے لگی۔ چونکہ ان سانچوں میں وہ ڈھل نہیں سکتی تھی۔ اس لیے طرح طرح کے الجھاؤ پیدا ہونے لگے اور پھر جس قدر کوششیں سلجھانے کی کی گئیں الجھاؤ اور زیادہ بڑھتے گئے۔

فطریت سے جب بعد ہو جاتا ہے اور وضعیت کا استغراق طاری ہو جاتا ہے تو طبیعتیں اس پر راضی نہیں ہوتیں کہ کسی بات کو اس کی قدرتی سادگی میں دیکھیں۔ وہ سادگی کے ساتھ حسن وعظمت کا تصور کر ہی نہیں سکتیں۔ وہ جب کسی بات کو بلند اور شاندار دکھانا چاہتی ہیں تو کوشش کرتی ہیں کہ زیادہ سے زیادہ وضعیت اور صناعیت کے پیچ وخم پیدا کر دیں۔ یہی معاملہ قرآن کے ساتھ پیش آیا ہے۔ سلف کی طبیعتیں وضعی طریقوں میں نہیں ڈھلی تھیں۔ اس لیے وہ قرآن کی سیدھی سادی حقیقت بے ساختہ پہچان لیتے تھے لیکن خلف کی طبیعتوں پر یہ بات شاق گزرنے لگی کہ قرآن اپنی سیدھی سادی شکل میں نمایاں ہو۔ ان کی وضعیت پسندی اس پر قانع نہیں ہو سکتی تھی۔ انہوں نے قرآن کی ہر بات کے لیے وضعیت کے جامے تیار کرنے شروع کر دیے اور چونکہ یہ جامہ اس پر راست نہیں آسکتا تھا۔ اس لیے بہ تکلف پہنانا چاہا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ حقیقت کی موزونیت باقی نہ رہی۔ ہر بات ناموزوں اور الجھی ہوئی بن کر رہ گئی۔

تفسیر قرآن کا پہلا دور وہ ہے جب علوم اسلامیہ کی تدوین وکتابت شروع نہیں ہوئی تھی۔ دوسرا دور تدوین وکتابت سے شروع ہوتا ہے۔ اور اپنے مختلف عہدوں اور طبقوں میں اترتا آتا ہے۔ ہم

محسوس کرتے ہیں کہ ابھی دوسرا دور شروع ہی ہوا تھا کہ یہ جامہ قرآن کے لیے بننا شروع ہو گیا۔ لیکن اس منتہائے بلوغ، فلسفہ وعلوم کی ترویج واشاعت کا آخری زمانہ ہے۔ یہی زمانہ ہے جب امام فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر لکھی اور پوری کوشش کی کہ قرآن کا سراپا اس مصنوعی لباس وضعیت سے آراستہ ہو جائے۔ اگر امام رازی کی نظر اس حقیقت پر ہوتی تو ان کی پوری تفسیر نہیں تو دو تہائی حصہ یقیناً بے کار ہو جاتا۔ بہر حال یاد رہے وضعیت کے سانچے جتنے ٹوٹتے جائیں گے۔ قرآن کی حقیقت اُبھرتی آئے گی۔

قرآن کے اسلوب بیان کی نسبت لوگوں کو جس قدر مشکلیں پیش آئیں محض اس لیے کہ وضعیت کا استغراق ہوا اور فطریت کی معرفت باقی نہ رہی۔ قرآن کے مختلف حصوں اور آیتوں کے مناسبات وروابط کے سارے الجھاؤ صرف اس لیے ہیں کہ فطریت سے بعد ہو گیا اور وضعیت ہمارے اندر بسی ہوئی ہے ہم چاہتے ہیں قرآن کو بھی ایک ایسی مرتب کتاب کی شکل میں دیکھیں جیسی کتابیں ہم مرتب کرتے ہیں۔

قرآن کی زبان کی نسبت بحثوں کا جس قدر انبار لگا دیا گیا ہے وہ بھی محض اس لیے ہے کہ فطرت کے سمجھنے کی ہم میں استعداد باقی نہیں رہی۔ قرآن کی بلاغت کا مسئلہ ہمارے وجدان کے لیے اس قدر سہل مگر ہمارے دماغ کے لیے اس قدر دشوار کیوں ہو رہا ہے! صرف اسی لیے کہ وضعیت کا خود ساختہ ترازو ہمارے ہاتھ میں ہے ہم چاہتے ہیں اسی سے قرآن کی بلاغت بھی وزن کریں۔

قرآن کا طریق استدلال کیوں نمایاں نہیں ہوتا؟ اس کے تمام دلائل وبراہین جنہیں وہ "حجۃ بالغۃ" سے تعبیر کرتا ہے کیوں مستور ہو گئے ہیں؟ اسی لیے کہ وضعیت کے استغراق نے منطق کا سانچہ ہمیں دے دیا ہے ہم چاہتے ہیں قرآن کے دلائل وبراہین بھی اسی میں ڈھالیں۔ غرضکہ جس گوشے میں جاؤ گے یہی اصل سامنے پاؤ گے۔

۲۔ جب کسی کتاب کی نسبت یہ سوال پیدا ہو، اس کا مطلب کیا ہے؟ تو قدرتی طور پر ان لوگوں کے فہم کو ترجیح دی جائے گی جنہوں نے خود صاحب کتاب سے مطلب سمجھا ہو۔ قرآن تیئس برس کے اندر بہ تدریج نازل ہوا۔ وہ جس قدر نازل ہوتا تھا صحابہ کرام سنتے تھے نمازوں میں دہراتے تھے اور جو کچھ پوچھنا ہوتا تھا۔ خود پیغمبر اسلام ﷺ سے پوچھ لیتے تھے۔ ان میں بعض افراد خصوصیت کے ساتھ فہم قرآن میں ممتاز ہوئے اور خود پیغمبر اسلام ﷺ نے اس کی شہادت دی مذہبی خوش اعتقادی کی بناء پر نہیں بلکہ قدرتی طور پر ان کے فہم کو بعد کے لوگوں کے فہم پر ترجیح ہونی چاہیے۔ لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں سمجھا گیا۔ بعد کے لوگوں نے اپنے اپنے عہد کے فکری مؤثرات کے ماتحت نئی نئی کاوشیں شروع کر دیں۔ اور سلف کی صریح تفسیر کے

خلاف ہر گوشے میں قدم اٹھا دیے۔ کہا گیا "سلف ایمان میں قوی ہیں لیکن علم میں خلف کا طریقہ قوی ہے"۔ حالانکہ خود سلف کا اپنی نسبت یہ اعلان تھا کہ "ابرھم قلوبا و اعمقھم علما۔ نتیجہ یہ نکلا کہ روز بروز حقیقت مستور ہوتی گئی اور اکثر گوشوں میں ایک صاف بات الجھتے الجھتے بالکل ناقابل حل بن گئی۔

آفت پر آفت یہ ہوئی کہ پہلے ایک کمزور پہلو اختیار کیا گیا۔ پھر بڑھتے بڑھتے دور تک نکل گئے۔ پھر جب مشکلوں سے دوچار ہوئے تو نئی نئی بحثوں اور کاوشوں کی عمارتیں اٹھانے لگے۔ متون، شرح، حواشی اور منسیات وتعلیقات کا طریقہ یہاں بھی چلا۔ اس نے اور زیادہ الجھاؤ میں الجھاؤ ڈالے، اور بعض صورتوں میں تو پردوں کی اتنی تہیں جمع ہو گئیں کہ ایک کے بعد ایک اٹھاتے چلے جاؤ۔ ظلمات بعضھا فوق بعض۔ کا عالم دکھائی دے گا۔

اس بات کا اندازہ کرنے کے لیے کہ قرآن کا کوئی ایک مقام لے لو پہلے اس کی تفسیر صحابہ و تابعین کی روایات میں ڈھونڈو پھر بعد کے مفسروں کی طرف رخ کرو اور دونوں کا مقابلہ کرو صاف نظر آجائے گا کہ صحابہ وسلف کی تفسیر میں بالکل واضح تھا۔ بعد کی بے محل دقیقہ سنجیوں نے اسے کچھ سے کچھ بنا دیا اور الجھاؤ پیدا ہو گئے۔

مثلاً سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیتوں کی نسبت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ "الذین یومنون بالغیب و یقیمون الصلوۃ ۔الخ" سے مقصود عرب کے اہل ایمان ہیں اور "والذین یومنون بما انزل الیک ۔الخ" سے اہل کتاب۔ امام ابن جریر نے بھی یہی تفسیر اختیار کی لیکن بعد کے مفسر اس پر قانع نہیں ہوئے اور عجیب عجیب دور از کار بحثیں پیدا کر دیں نتیجہ یہ نکلا کہ پہلے "ھدی للمتقین" کے مطلب کی نشست بگڑی پھر قرآن نے تین گروہوں کی تقسیم کر کے جس بات پر زور دیا تھا اس کی ساری خوبی اور حقیقت گم ہو گئی۔

۳۔ مسلم اقوام کے قصص وروایات اول دن سے پھیلنا شروع ہو گئے تھے۔ ان میں اسرائیلیات (یعنی یہودیوں کے قصص وخرافات) کو ہمیشہ محققین نے چھانٹنا چاہا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان عناصر کے بھی اثرات دور دور تک سرایت کر چکے تھے اور وہ برابر جسم تفسیر میں پیوست رہے۔

۴۔ ایک طرف تو صحابہ وسلف کی روایات سے تغافل ہوا۔ دوسری طرف روایات تفسیر کے غیر محتاط جامعوں نے الگ آفت بپا کر دی اور ہر تفسیر جس کا سر کسی نہ کسی تابعی سے ملا دیا گیا، سلف کی تفسیر سمجھ لی گئی۔

۵۔ اس صورت حال کا سب سے زیادہ افسوس ناک نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن کا طریق استدلال دور از کار دقیقہ سنجیوں میں گم ہو گیا۔ یہ ظاہر ہے کہ اس کے تمام بیانات کا محور ومرکز اس کا طریق استدلال ہی ہے۔ اس

کے ارشادات وبصائر، اس کے قصص وامثال، اس کے مواعظ وحکم، اس کے مقاصد ومہمات سب اسی چیز سے کھلتے اور ابھرتے تھے۔ یہ ایک چیز کیا گم ہوئی گویا اس کا سب کچھ ہی گم ہوگیا۔

ہمیں ورق کہ سیہ گشتہ مدعا ایں جاست

انبیاء کرام کا طریق استدلال یہ نہیں ہوتا کہ منطقی طریقہ پر نظری مقدمات ترتیب دیں پھر ان کی بحثوں میں مخاطب کو الجھانا شروع کردیں۔ وہ براہ راست تلقین واذعان کا فطری طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ اسے ہر دماغ وجدانی طور پر پالیتا ہے، ہر دل قدرتی طور پر قبول کرلیتا ہے لیکن ہمارے مفسروں کو فلسفہ ومنطق کے انہماک نے اس قابل ہی نہ رکھا کہ کسی حقیقت کو اس کی سیدھی سادی شکل میں دیکھیں اور قبول کریں۔

انہوں نے انبیاء کرام کے لیے بڑی فضیلت اس میں سمجھی کہ انہیں منطقی بنادیں اور قرآن کی ساری عظمت اس میں نظر آئی کہ اس کی ہر بات ارسطو کی منطق کے سانچے میں ڈھلی ہوئی نکلے۔ اس سانچے میں وہ ڈھل نہیں سکتی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن کے دلائل وبراہین کی ساری خوب روئی اور دل نشینی طرح طرح کی بناوٹوں میں گم ہوگئی۔ حقیقت تو گم ہو ہی چکی تھی۔ لیکن وہ بات بھی نہ بنی جو لوگ بنانی چاہتے تھے۔ شکوک وایرادات کے بے شمار دروازے کھل گئے ان کے کھولنے میں تو امام رازی کا ہاتھ بہت تیز نکلا لیکن بند کرنے میں تیزی نہ دکھا سکے۔

۶۔ یہ آفت صرف طریق استدلال ہی میں پیش نہیں آئی بلکہ تمام گوشوں میں پھیلی۔ منطق وفلسفہ کے مباحث نے طرح طرح کی نئی مصلحات پیدا کردی تھیں۔ عربی لغت کے الفاظ ان مصطلحہ معانی میں مستعمل ہونے لگے تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ قرآن کا موضوع فلسفہ یونانی نہیں ہے اور نہ نزول قرآن کے وقت عربی زبان ان مصطلحات سے آشنا ہوئی تھی۔ پس جہاں کہیں قرآن میں وہ الفاظ آئے ہیں، ان کے معانی وہ نہیں ہوسکتے جو وضع مصطلحات کے بعد قرار پائے لیکن اب ان کے وہی مفہوم لیے جانے لگے اور اس کی بنا پر طرح طرح کی دور از کار بحثیں پیدا کردی گئیں۔ چنانچہ خلود، احدیت، مشیت، تفضل، حجت، برہان، تاویل وغیرہ بانے وہ معانی پیدا کرلیے، جن کا صدر اول میں کسی سامع قرآن کو وہم وگمان بھی نہ ہوا ہوگا۔

۷۔ اسی تخم کے یہ بھی برگ وبار ہیں کہ سمجھا گیا کہ قرآن کو وقت کی تحقیقات علمیہ کا ساتھ دینا چاہیے۔ چنانچہ کوشش کی گئی کہ نظام بطلیموسی اس پر چپکا یا جائے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح آج کل کے دانش

فروشوں کا طریق تفسیر یہ ہے کہ موجودہ علم ہیئت کے مسائل قرآن پر چپکائے جائیں۔

۸۔ ہر کتاب اور تعلیم کے کچھ مرکزی مقاصد ہوتے ہیں اور اس کی تمام تفصیلات انہی کے گرد گردش کرتی ہیں۔ جب تک مراکز سمجھ میں نہ آئیں، دائرہ کی کوئی بات سمجھ میں نہیں آسکتی۔ قرآن کا بھی یہی حال ہے اس کے بھی چند مرکزی مقاصد ومہمات ہیں اور جب تک وہ صحیح طور پر نہ سمجھ لیے جائیں اس کی کوئی بات صحیح طور پر سمجھی نہیں جاسکتی۔

متذکرہ صدر اسباب سے جب اس کے مرکزی مقاصد کی وضاحت باقی نہ رہی۔ تو قدرتی طور پر اس کا ہر گوشہ اس سے متاثر ہوا۔ اس کا کوئی بیان، کوئی تعلیم، کوئی استدلال، کوئی خطاب، کوئی اشارہ، کوئی اجمال ایسا نہ رہا جو اس تاثر سے محفوظ ہو، افسوس یہ ہے کہ اختصار کا تقاضا مثالیں پیش کرنے سے مانع ہے اور بغیر مثال کے حقیقت واضح نہیں ہوسکتی مثلاً آل عمران کی آیت "وما کان لنبی ان یغل (۳:۱۶۱) کی تفسیر نکال کر دیکھو کیا کیا دور از کار بحثیں نہیں کی گئیں؟ یہودیوں کے اس قول کی تفسیر میں کہ "ید اللہ مغلولۃ" (۵:۶۴) کن کن گوشوں میں نہیں نکل گئے اور کس طرح محل بیان اور سیاق وسباق کا صاف صاف مقتضا نظر انداز کردیا گیا؟

۹۔ قرآن کے صحت فہم کے لیے عربی لغت وادب کا صحیح ذوق شرط اول ہے لیکن مختلف اسباب سے جن کی تشریح محتاج تفصیل ہے یہ ذوق کمزور پڑتا گیا یہاں تک کہ وہ وقت آگیا جب مطالب میں بے شمار الجھاؤ محض اس لیے پڑ گئے کہ عربیت کا ذوق سلیم باقی نہیں رہا اور جس زبان میں قرآن نازل ہوا تھا اس کے محاورات ومدلولات سے یک قلم بعد ہوگیا۔

۱۰۔ ہر عہد کا فکری اثر تمام علوم وفنون کی طرح تفسیر میں بھی کام کرتا رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تاریخ اسلام کا یہ پر فخر واقعہ ہمیشہ یادگار رہے گا کہ علماء حق نے وقت کے سیاسی اثرات کے سامنے کبھی ہتھیار نہیں ڈالے۔ اور کبھی یہ بات گوارا نہ کی کہ اسلام کے عقائد ومسائل ان سے اثر پذیر ہوں۔ لیکن وقت کی تاثیر صرف سیاست ہی کے دروازے سے نہیں آتی۔ اس کے نفسیاتی موثرات کے بے شمار دروازے ہیں اور جب کھل جاتے ہیں تو کسی کے بند کیے بند نہیں ہوسکتے۔ ان کے استیلاء سے عقائد واعمال محفوظ نہیں رکھے جاسکتے تھے اور علماء حق نے محفوظ رکھے لیکن دماغ محفوظ نہیں رکھے جاسکتے تھے اور محفوظ نہیں رہے۔ یہاں ضرورت مثالوں کی ہے، لیکن اس کی مثالیں تفصیل طلب ہیں اختصار کا تقاضا اجازت نہیں دیتا۔

۱۱۔ چوتھی صدی ہجری کے بعد علوم اسلامیہ کی تاریخ کا مجتہدانہ دور ختم ہوگیا اور شواذ ونو کے علاوہ شاہراہ تقلید کی شاہراہ ہوگئی اس داء عضال نے جسم تفسیر میں بھی پوری طرح سرایت کی۔ ہر شخص جو تفسیر کے لیے

قدم اٹھاتا تھا کسی پیش رو کو اپنے سامنے رکھ لیتا تھا اور پھر آنکھیں بند کر کے اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہتا اگر تیسری صدی میں کسی مفسر سے کوئی غلطی ہوگئی ہے تو ضروری ہے کہ نویں صدی کی تفسیروں تک وہ برابر نقل در نقل ہوتی چلی آئے۔ کسی نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ چند لمحوں کے لیے تقلید سے الگ رہ کر تحقیق کرلے کہ معاملہ کی اصلیت کیا ہے؟ رفتہ رفتہ تفسیر نویسی کی ہمتیں اس قدر پست ہوگئیں کہ متداول تفسیر پر حاشیہ چڑھا دینے سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ بیضاوی اور جلالین کے حاشیے دیکھو، ایک بنے ہوئے مکان کی لیپ پوت کرنے میں کس طرح قوت تصنیف رائیگاں گئی ہے؟

۱۲۔ زمانے کی بدذوقی نے بھی ہر کج اندیشی کو سہارا دیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرون اخیرہ میں درس وتد اول کے لیے وہی تفسیریں مقبول ہوئیں جو قدماء کے محاسن سے یک قلم خالی تھیں۔ وقت کا یہ سوء انتخاب ہر علم وفن میں جاری رہا ہے۔ جو زمانہ جرجانی پر سکاکی کو اور سکاکی پر تفتازانی کو ترجیح دیتا تھا۔ یقیناً اس کے دربار سے بیضاوی وجلالین ہی کو حسن قبول کی سند مل سکتی تھی۔

۱۳۔ متداول تفسیریں اٹھا کر دیکھو جس مقام کی تفسیر میں متعدد اقوال موجود ہوں وہاں اکثر اسی قول کو ترجیح دیں گے جو سب سے زیادہ کمزور اور بے محل ہوگا جو اقوال کی نقول کریں گے۔ ان میں بہتر قول موجود ہوگا۔ لیکن اسے نظر انداز کر دیں گے۔

۱۴۔ اشکال وموانع کا بڑا دروازہ تفسیر بالرائے سے کھل گیا جس کے اندیشے سے صحابہ وسلف کی روحیں لرزتی رہتی تھیں۔

تفسیر بالرائے کا مطلب سمجھنے میں لوگوں کو لغزشیں ہوئی ہیں۔ تفسیر بالرائے کی ممانعت سے مقصود یہ نہ تھا کہ قرآن کے مطالب میں عقل وبصیرت سے کام نہ لیا جائے کیونکہ اگر یہ مطلب ہو تو پھر قرآن کا درس و مطالعہ ہی بے سود ہو جائے حالانکہ قرآن کا یہ حال ہے کہ اول سے لے کر آخر تک تعقل وتفکر کی دعوت ہے۔ اور ہر جگہ مطالبہ کرتا ہے کہ "افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالھا" (۴۷:۲۴) دراصل تفسیر بالرائے میں "رائے" لغوی معنی میں نہیں ہے، بلکہ "رائے" مصطلح شارع اور اس سے مقصود ایسی تفسیر ہے جو اس لیے نہ کی جائے کہ خود قرآن کیا کہتا ہے بلکہ اس لیے کی جائے کہ ہماری کوئی ٹھہرائی ہوئی رائے کیا چاہتی ہے اور کس طرح قرآن کو کھینچ کر اس کے مطابق کر دیا جا سکتا ہے۔

مثلاً جب باب عقائد میں رد وکد شروع ہوئی تو مختلف مذاہب پیدا ہو گئے۔ ہر مذہب کے مناظر نے یہ چاہا، اپنے مذہب پر نصوص قرآنیہ کو ڈھالے وہ اس کی جستجو میں نہ تھے کہ قرآن کیا کہتا ہے؟ بلکہ ساری کاوش اس کی تھی کہ کسی طرح اسے اپنے مذہب کی مؤید دکھلا دیں۔ اسی طرح کی تفسیر بالرائے

تھی۔

یا مثلاً مذہب تشبیہ کے مقلدوں میں جب تحزب وتشیع کے جذبات تیز ہوئے تو اپنے مسائل کی بیچ میں آیات قرآنیہ کو کھینچنے تاننے لگے۔ اس کی کچھ فکر نہ تھی کہ لغت عربی کے صاف صاف معانی، اسلوب بیان کا قدرتی مقتضی عقل وبصیرت کا واضح فیصلہ کیا کہتا ہے؟ تمام تر کوشش یہ تھی کہ کسی نہ کسی طرح قرآن کو اپنے امام کے مذہب کے مطابق کر دکھائے۔ یہ طریق تفسیر بالرائے ہے۔

یا مثلاً صوفیہ کا ایک گروہ اسرار وبطون کی جستجو میں دور تک نکل گیا اور پھر اپنے موضوعہ عقائد و مباحث پر قرآن کو ڈھالنے لگا۔ قرآن کا کوئی حکم، کوئی عقیدہ، کوئی بیان تحریف معنوی سے نہ بچا یہ تفسیر تفسیر بالرائے تھی۔

یا مثلاً قرآن کے طریق استدلال کو منطقی جامہ پہنانا یا جہاں کہیں آسمان اور کواکب ونجوم کے الفاظ آگئے ہیں یونانی علم ہیئت کے مسائل چپکانے لگا۔ یقیناً تفسیر بالرائے ہے۔

یا مثلاً آج کل ہندوستان اور مصر کے بعض مدعیان اجتہاد ونظر نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ زمانہ حال کے اصول علم وترقی قرآن سے ثابت کیے جائیں۔ یا جدید تحقیقات علمیہ کا اس سے استنباط کیا جائے، گویا قرآن صرف اسی لیے نازل ہوا کہ جس بات کو کوپرنیکس (Copernicus) اور نیوٹن (Newton) نے یا ڈارون (Darwin) اور ویلس (Wallace) نے بغیر کسی الہامی کتاب کے فلسفہ اندیشیوں کے دریافت کر لی۔ اسے چند صدی پہلے معموں کی طرح دنیا کے کان میں پھونک دے اور پھر وہ بھی صدیوں تک دنیا کی سمجھ میں نہ آئیں، یہاں تک کہ موجودہ زمانہ کے مفسر پیدا ہوں اور تیرہ سو سال پیشتر معمے حل فرمائیں۔ یقیناً یہ طریق تفسیر بھی ٹھیک ٹھیک تفسیر بالرائے ہے۔

جستجوئے حقیقت

یہ چند اشارات ہیں کہ اختصار کے تقاضے اور محل کی تنگنائی پر بھی حوالہ قلم ہوئے، ورنہ شرح اس معاملے کی بہت طولانی ہے۔ تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل۔ کم از کم ان مجمل اشارات سے اس بات کا اندازہ کر لیا جا سکتا ہے کہ راہ کی مشکلات وموانع کا کیا حال ہے اور کس طرح قدم قدم پر پردوں کو ہٹانا، اور چپہ چپہ پر رکاوٹوں سے دوچار ہونا ہے۔ پھر رکاوٹیں کسی ایک گوشے ہی میں نہیں ہیں اور مشکلات کسی ایک دروازے ہی سے نہیں آتی ہیں۔ بہ یک وقت ہر وادی کی پیمائش اور ہر گوشے میں نظر و کاوش ہونی چاہیے۔ تب کہیں جا کر حقیقت گم گشتہ کا سراغ مل سکتا ہے۔

دعوت فکر و نظر

کیا مسیار میرج جائز ہے؟

ڈاکٹر محمد شکیل اوج

مرد و عورت کے مابین ازدواجی رشتہ بذریعہ نکاح قائم ہوتا ہے جو اپنے قیام میں ہر دو فریق کی باہمی رضامندی کا متقاضی ہوتا ہے اس رضامندی کو اصطلاح شریعت میں ایجاب و قبول کہتے ہیں۔ بالعموم یہ نکاح بغیر کسی شرط کے وقوع پذیر ہوتا ہے اور گاہے لڑکی والوں کی طرف سے کوئی شرط بھی عائد کردی جاتی ہے۔ مثلاً منکوحہ کو ماہانہ اتنی رقم بطور جیب خرچ کے لازماً دینی ہوگی وغیرہ وغیرہ واضح رہے کہ اسطرح کی شرطیں عام طور پر لڑکی کے تحفظ (Protection) کے لئے عائد کی جاتی ہیں۔

نکاحوں میں شرطوں کا حوالہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نکاح سے دیا جاتا ہے کہ جس میں انہیں آٹھ یا پھر دس سال اپنے سسر کے ہاں ملازمت اختیار کرنے کا پابند کیا گیا تھا۔ اور ان دونوں مدتوں میں سے پہلی مدت لازمی اور دوسری اختیاری تھی۔

قال انی ارید ان انکحک احدی ابنتی ھتین علی ان تاجرنی ثمنی حجج فان اتممت عشرا فمن عندك۔ (قصص/۲۷)

(لڑکی کے باپ نے موسیٰ سے) کہا میں چاہتا ہوں کہ اپنی ان دونوں بیٹیوں میں سے کسی ایک کا نکاح تم سے کردوں، اس شرط پر کہ تم آٹھ سال تک میری ملازمت میں رہو اور اگر دس سال پورے کردو تو یہ تمہاری طرف سے احسان ہوگا۔

آیت میں تاجرنی کے لفظ پر نظر رہے۔ تاجرنی کا مطلب ہے تم میری ملازمت کرو (یعنی لڑکی کے باپ کی) اگر لڑکی کی ملازمت مطلوب ہوتی تو تاجرنی کے بجائے تاجرھا ہوتا اور یوں اسے مہر کا بدل قرار دینا بھی ممکن ہوتا۔

سیاق عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ آٹھ سال کی مزدوری کو نکاح کی شرط بنایا گیا ہے نہ کہ مہر کو۔ کیونکہ ارادۂ نکاح سے پہلے ہی موسیٰ علیہ السلام کو اجرت پر رکھنے کا مشورہ خود لڑکی نے دیا تھا (آیت

۲۶) آیت نمبر ۲۵ میں بھی اجر کا لفظ آیا ہے جو مویشیوں کو پانی پلانے کی جزاء کے مفہوم پر مشتمل ہے اور آیت نمبر ۲۶ میں استاجرہ۔ اور من استاجرت کے الفاظ صراحت کے ساتھ اجارہ کے مفہوم پر دلالت کرتے ہیں۔ اجارہ دراصل اجرت دے کر کام کرانے کو کہتے ہیں۔ جو مہر کا بدل نہیں ہوتا۔ اور ویسے بھی نکاح کی بات آیت نمبر ۲۷ میں آتی ہے اس لیئے ان تاجرنی کا مطلب، نکاح کے لئے اجارہ بطور شرط کے بنتا ہے نہ کہ بطور مہر کے۔

بہر حال آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انعقاد نکاح کے لئے شرعی اعتبار سے کسی بھی جائز شرط کو موقع و محل کی مناسبت سے اختیار کیا جاسکتا ہے۔

مگر زمانے کی تیزی سے بدلتی ہوئی اقدار نے مذہب و اخلاق کی دنیا پر بھی اپنا اثر ڈالا ہے۔ ہمیشہ سے رشتہ ازدواج میں مرد کی فعالیت اور عورت کی انفعالیت اہم اور بنیادی عامل کا کردار ادا کرتے رہے ہیں اور اس فرق و امتیاز کی بنیاد پر نظام کار وضع کیا جاتا رہا ہے۔ پھر اسی تفریق پر اصلاً مرد کا میدان بیرون خانہ اور عورت کا درون خانہ مقرر ہوا ہے۔ شوہر کو کفیل و نگران ہونے کی بناء پر ایک گونہ فضیلت کا درجہ بھی حاصل رہا ہے۔ مگر فی زمانہ یورپین اسٹائل آف لائف نے مسلمان معاشروں کے اندر وہ تمام قدریں بری طرح جھنجھوڑ ڈالی ہیں جنہوں نے صدیوں نہیں ہزاروں برس دنیا حکمرانی کی ہے۔ اور جو کم و بیش تمام مذاہب و اقوام کا مشترک سرمایہ رہی ہیں۔

نکاح کے تعلق سے اب ایک نئی اصطلاح متعارف ہوئی ہے۔ جسے مسیار کا نام دیا جاتا ہے۔ اس نکاح میں مرد و عورت بالکل عام طریقے سے رشتہ ازدواج میں بندھتے ہیں مگر اس میں مرد کا کردار عورت کے حق میں غیر کفالتی ہوتا ہے یعنی وہ بیوی کی طرف سے کسی بھی معاشی ذمہ داری سے دور رکھا جاتا ہے اور یہ بات بوقت نکاح یا قبل از نکاح مرد کے ساتھ طے کر لیجاتی ہے۔

کہاں وہ پرانی قدر کہ جسمیں مرد کو کفالت کے بندھن میں کس کر جکڑ دیا جاتا تھا اور کہاں یہ پیش آمدہ صورت حال کہ جسمیں مرد کو اس اہم ذمہ داری سے سبکدوش کر دیا گیا ہے۔ یقیناً اس بدلتی ہوئی قدر کے متعدد اسباب ہو سکتے ہیں۔ جنکی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ ہم نے تو یہاں مسیار کے جواز و عدم جواز کے باب میں اپنا دوٹوک نقطہ نظر بیان کرنا ہے جو خالصتاً شرعی نوعیت کا ہے۔

انعقاد نکاح کی تمام صورتیں مسیار میں اگر پائی جاتی ہوں تو ہم اسے نکاح صحیح قرار دینے پر مجبور ہیں۔ فقہاء نے نکاح کی شرائط کو تین انواع میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ شرائط انعقاد نکاح

۲۔شرائط جواز نکاح

۳۔شرائط لزوم نکاح

انعقاد نکاح کی پہلی شرط عقل، دوسری بلوغ اور تیسری رضامندی ہے۔

یہ وہ شرائط ہیں جنکا تعلق عاقدین نکاح سے ہے جبکہ چوتھی شرط اتحاد مجلس اور پانچویں مجلس عقد میں گواہوں کی موجودگی ہے۔ یہ وہ شرائط ہیں کہ جنکا تعلق مجلس عقد سے ہے۔ (جواز نکاح اور لزوم نکاح کا موضوع زیر بحث سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لیئے اس سے صرف نظر کیا گیا ہے)

مرد کے ذمہ نکاح کے تعلق سے دو اہم فرائض عائد ہوتے ہیں (۱) مہر کی ادائیگی، (۲) ہان و نفقہ کی ادائیگی۔ مگر عورت کو اختیار ہے کہ وہ اپنے مہر کو بالکلیہ یا اسمیں سے کچھ حصہ واپس کردے یا ادائیگی سے قبل ہی اسے جزءً یا کلیۃً معاف کردے۔ اسطرح اگر کوئی عورت بوجہ اچھی ملازمت یا اپنی مالداری کے اپنے شوہر کو ادائی نفقہ سے آزاد کردے تو اس سے نفس نکاح میں کسی قسم کا کوئی فساد واقع نہیں ہوتا۔ کیا ہمارے معاشرے میں ایسی مثالیں موجود نہیں ہیں کہ بیویاں کمارہی ہیں اور شوہروں کے پاس نہ کوئی ملازمت ہے اور نہ ہی کاروبار۔ اس لیئے مجبوراً حالات سے سمجھوتہ کرتے ہوئے انہوں نے گھریلو ذمہ داریاں اپنے سر لے لی ہیں۔ پھر کسی شرط کے عائد کرنے کا کسی قدر غالب (شرط) کے فقدان سے اسکی شرعی حیثیت بہرحال مجروح نہیں ہوجاتی۔ تاہم عام حالات میں ایسے نکاح کو پسندیدہ اور مستحسن بھی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ہاں کسی خاص صورت حال میں اسطرح کے نکاح یقیناً مفید بھی ثابت ہوسکتے ہیں۔ اور معاشرے میں زنا کو روکنے کا ذریعہ بھی۔ اس لیئے اصلاً اسے جواز کی نظر سے دیکھنا چاہیے۔

مسیار کی ایک دوسری شکل یہ بھی ہے کہ مرد بہت مالدار ہو اور عورت، غریب ایسا مرد جب کسی عورت سے نکاح کرتا ہے تو اسے مہر میں گراں قدر رقم کے ساتھ ساتھ تحفے تحائف بھی دیتا ہے۔ اکثر و بیشتر جائیداد بھی، پھر کچھ عرصے بعد اسے طلاق دے کر چلا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مسیار میں طلاق بطور شرط کے نہیں ہوتی۔ ہاں بالعموم ایسا ضرور ہوتا ہے کہ نکاح کرنے والا کچھ عرصہ کے بعد اسے چھوڑ جاتا ہے مگر وہ اسے معلقہ کی حالت میں نہیں چھوڑتا بلکہ اکثر عورت کو اسکی حیثیت سے بڑھ کر مال و متاع دیکر جاتا ہے مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ ۱۹ جولائی ۲۰۰۶ء کے حوالے سے انٹرنیٹ سے جاری ہونے والی ایک رپورٹ کے مطابق ۲۰ فیصد مسیار شادیاں، طلاق سے محفوظ قرار دی گئی ہیں۔ مسیار شادیوں میں گو وہ کتنے ہی محدود مدت پر کیوں نہ ختم ہوگئی ہوں اگر اسمیں ثبوت نسب اور ایک دوسرے کی زوجیت میں مرنے کی صورت میں حصول وراثت سے انکار نہ پایا جاتا ہو۔ تو اسے صراحتاً جائز قرار دیا جائے گا۔

روایت تلك غرانيق العلى کی تحقیق

علامہ غلام رسول سعیدی
سابق رکن اسلامی نظریاتی کونسل، حکومت پاکستان
شیخ الحدیث والتفسیر دارالعلوم نعیمیہ، کراچی

وما ارسلنا من قبلك من رسول ولا نبی الا اذا تمنی القی الشیطن فی امنیته. فینسخ الله مایلقی الشیطن ثم یحکم الله ایته والله علیم حکیم۔ (الحج/۵۲)

اور ہم نے آپ سے پہلے جو بھی رسول اور نبی بھیجا تو جب بھی اس نے (اپنی امت کو دعوت کی) تمنا کی تو شیطان نے (لوگوں کے دلوں میں شبہات ڈال کر) اسکی تمنا (پوری ہونے) میں رخنہ ڈال دیا۔ سو اللہ شیطان کے ڈالے ہوئے (شبہات) کو زائل کردیتا ہے۔ پھر اللہ اپنی آیات کو پختہ کردیتا ہے اور اللہ خوب جاننے والا، بہت حکمت والا ہے۔

الحج:۵۲ کے چند مشہور تراجم

شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی متوفی ۶۹۱ھ لکھتے ہیں:

ونفرستادیم پیش از تو پیچ رسولے و نہ خبر دہندہ از خدا مگر چوں تلاوت کرد بیفکند شیطان در تلاوت او آنچہ خواست پس ابطل گرداند خدائے آنچہ در افگندہ باشد شیطان پس ثابت کند خدائے آیت ہائے خود را۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی متوفی ۱۱۷۶ھ لکھتے ہیں:

و نہ فرستادیم پیش از تو پیچ فرستادہ و نہ پیچ صاحب وحی الا چوں آرزوئے بخاطر بست با فگند شیطان چیزے در آرزوئے وے پس دور سازد خدا آنچہ شیطان انداختہ است باز محکم سازد خدا آیات